علامہ اقبالؒ اور قادیانیت

حکیم محمود احمد ظفر، سیالکوٹ

یورپ کے صنعتی انقلاب نے جہاں دنیا میں ترقی کے دروازے کھولے، وہاں براعظم ایشیا اور افریقہ کے بہت سے ملکوں کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑا۔ ان ملکوں میں ایک ملک برصغیر پاک و ہند بھی تھا۔ اس خطے میں مسلمانوں نے قریباً ایک ہزار سال تک اپنے اقتدار کا پھریرا لہرایا اور سلطان محمود غزنویؒ، محمد غوری، قطب الدین ایبک، سلطان شمس الدین التمش اور آخر میں اورنگ زیب عالمگیرؒ جیسے عظمت مآب شہنشاہ دیکھے، جنھوں نے اپنی رعایا کو ہر حال میں خوش و خرم رکھا۔ اورنگ زیب عالمگیرؒ کے بعد مغلوں کی اپنی غلطیوں سے انگریز جو تاجروں کے روپ میں ہندوستان میں آئے تھے بالآخر مسند حکومت پر قابض ہو گئے۔

یورپی تاجروں کا ہندوستان میں ورود:

انگریزوں سے قبل ہندوستان میں پرتگالی وارد ہوئے۔ یورپ کی صلیبی طاقتوں نے مسلمانوں سے صلیبی جنگوں میں شکست کے بعد یہ پلان بنایا کہ مشرقی ممالک میں ایک ایسی عیسائی حکومت قائم کی جائے جو اپنی طاقت کے بل بوتے پر مسلمانوں سے مقامات مقدسہ چھین لے۔ دوسری طرف پرتگالی حکمران ہنری (1349-1460ء) نے عیسائی مبلغین کو ایک پیغام بھیجا جس میں ایک چیز یہ بھی تھی کہ غیر مسلم ملکوں میں اسلامی فوجوں کی یورش پر پابندی لگا دی جائے۔ یہ ہنری وہی حکمران ہے جس کے باپ یوحنا نے مسلمانوں کو اندلس سے نکالنے میں بنیادی کردار ادا کیا تھا۔ اس شخص کے دل میں مسلمانوں کے خلاف ایک خاص نفرت بھری ہوئی تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ دین اسلام کو تباہ و برباد کر کے مسلمانوں کو حرف غلط کی طرح صفحہ ہستی سے مٹا دیا جائے اور پوری دنیا

میں صلیبی جھنڈا لہرایا جائے۔

اس شخص کے عزائم یہ تھے کہ اندلس سے مسلمانوں کے اخراج کے بعد اب ہندوستان کا رخ کیا جائے اور اس وسیع وعریض ملک کو بھی سرزمین اندلس کی طرح مسیحیت کے دائرے میں داخل کرلیا جائے۔ اپنے اس مقصد کی تکمیل کے لیے ۱۴۱۷ء میں اس نے ''یسوع مسیح کے مجاہدین'' کے نام سے ایک تبلیغی دستے کی تشکیل کی اور انہیں خطیر رقم دے کر افریقہ اور ایشیا کے ملکوں کو روانہ کیا تاکہ ان ملکوں میں عیسائیت کی تبلیغ کے میدان کو وسیع کیا جائے اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کو دین مسیحی میں داخل کیا جائے۔ (ملاحظہ ہو تاریخ اسلام فی الہند عبدالمنعم نمبر، ص ۳۳۳، بانیکار: آسیا والسیطرۃ الغربیۃ، ص ۴۷)

''پاپائے روم نیکولس پنجم نے ۱۴۵۴ء میں اپنے پیغام میں ہمیں کہا کہ اس بات کی انتہائی خوشی ہے کہ ہمارے بیٹے ہنری بادشاہ پرتگال نے اپنے والد کے نقش قدم پر چل کر وہ کام کرنا شروع کیا جو اس کے والد نے اندلس میں کیا تھا۔ یہ سب کچھ وہ اس غیرت اور بہادری کے باعث کر رہا ہے جو مسیحی کے ایک سپاہی کے اندر ہونی چاہیے۔''

(بانیکار: آسیا والسیطرۃ الغربیۃ، ص ۳۷)

اس سلسلہ میں ایک وفد ہندوستان بھی آیا۔ اس نے مختلف مقامات کا دورہ کیا اور واپسی پر شاہ پرتگال کو رپورٹ دی کہ فوجی، سیاسی، تجارتی اور مذہبی میدانوں میں وہاں کامیابی کے غیر معمولی امکانات ہیں۔ اس رپورٹ کا جائزہ لینے کے بعد ہندوستان کے ساحلی علاقوں گوا، دمن، کلکتہ اور مالابار میں پرتگالیوں نے سب سے پہلے تجارتی دفاتر قائم کیے اور اس کے بعد تجارت کے پردے میں اپنے اصلی مشن کا آغاز کیا۔ چنانچہ ان ساحلی علاقوں میں لبنان اور شام کے عیسائیوں کی ایک بہت بڑی تعداد کو لاکر آباد کیا گیا جو تجارت کے پردہ میں عیسائی دعوت کے کاموں میں بڑی مہارت اور تجربہ رکھتے تھے۔

ان لوگوں نے وہاں آباد ہوتے ہی غیر مسلم آبادی پر اپنا حربہ آزمایا جو غیر معمولی طور پر کامیاب رہا۔ ایک طرف تو ان لوگوں نے وہاں کی غیر مسلم آبادی کو عیسائی بنانا شروع کر دیا اور

دوسری طرف ان ساحلی علاقوں پر قبضہ کر کے پرتگال کے ساتھ تجارتی تعلقات کو مزید مستحکم اور مضبوط کرلیا جو آگے چل کر عیسائیوں کے لیے فوجی اور اقتصادی لحاظ سے بڑا مفید ثابت ہوا۔ عیسائی پادریوں نے کافی زمانے تک اس بات کی کوشش کی کہ مغل عیسائیت قبول کرلیں، لیکن ان کی یہ کوشش کامیاب نہ ہوئی۔ (کلیۃ التبشیر والاستعمار فی البلاد العربیۃ، ص ۱۱۵)

پرتگالیوں نے مغل بادشاہ جلال الدین محمد اکبر کے دربار میں مختلف اوقات میں تین وفود بھیجے۔ اکبر نے ان وفود کا نہایت گرم جوشی سے خیر مقدم کیا اور ان کی درخواست پر عواقب سے ناآشنا ہونے کی وجہ سے انہیں آگرہ میں ایک گرجا گھر کے قیام کی اجازت دے دی اور اس کے ساتھ شہزادہ سلیم کو تربیت کے لیے ان پادریوں کے حوالے کر دیا۔ تین سال تک یہ عیسائی وفد اکبر کے پاس اس امید پر مقیم رہا کہ شاید اکبر عیسائی ہو جائے یا شہزادہ سلیم دین عیسوی قبول کرلے لیکن انہیں اپنے اس مکروہ مقصد میں کامیابی نہ ہوئی۔ یہ وفد ۱۵۵۳ء میں واپس چلا گیا اور ۱۵۹۰ء میں ایک دوسرا وفد دربار اکبری میں آیا، لیکن ۱۵۹۴ء میں وہ بھی نامراد واپس چلا گیا۔

(جمال الدین الشیال، تاریخ دولۃ اباطرۃ المغول الاسلامیہ فی الہند، ص ۹۲)

اکبر ہی کی نوازش سے پرتگالیوں نے تجارت کے نام پر گوا اور دوسرے ساحلی علاقوں میں اپنے سیاسی اور تبلیغی اڈے قائم کر لیے جن میں مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کو عیسائی بنانے کی کوششیں کی جاتیں، تاکہ عیسائی آبادی میں اضافہ کیا جائے۔ انہوں نے اب تو بہت سی جگہوں پر اسلامی سرحدوں میں مداخلت شروع کر دی تھی اور تجارت کے پردے میں وہاں کے لوگوں کو قید کر کے یورپ کی منڈیوں میں فروخت کرنا شروع کر دیا تھا۔

شہزادہ سلیم کے بعد جب اس کا بیٹا شاہ جہان تخت پر بیٹھا اور اسے پرتگالیوں کے جور وستم کا پتہ چلا تو اس نے ۱۶۲۷ء میں بنگال کے گورنر قاسم خان کو حکم دیا کہ عیسائیوں کے مراکز پر قبضہ کر کے عوام الناس کو ان کے ظلم وستم سے نجات دلائی جائے۔ قاسم خان نے حکم کی تعمیل کی اور ان کے مضبوط قلعوں کو زمین بوس کر دیا اور دس ہزار ہندوستانیوں کو پرتگالیوں کے قبضہ سے رہا کرالیا جنہیں یورپ

کی منڈیوں میں فروخت کرنے کے لیے جہازوں میں قید کر کے رکھا گیا تھا.

لوگوں کو عیسائی بنانے کا پرتگالیوں کو اس قدر جنون تھا کہ وہ آزاد لوگوں کو غلام بنا کر فروخت کرنے سے بھی نہیں چوکتے تھے تا کہ ان غلاموں کو ان کے آقا عیسائی بنا سکیں۔ چنانچہ شاہ جہاں کے بعد جب اس کا بیٹا اورنگ زیب عالم گیر تخت نشین ہوا تو پرتگالیوں کے ظلم وستم اس کی نگاہ میں بھی تھے۔ چنانچہ اس نے اس وقت کے بنگال کے گورنر شائستہ خان کو حکم دیا کہ وہ پرتگالیوں کے رہے سہے مراکز کو بھی نیست و نابود کر دے۔ شائستہ خان نے حکم کی تعمیل کی اور پرتگالیوں کی قوت کے خاتمہ کے لیے بھرپور ایکشن لیا۔ اس مہم میں بنگال کے بحری بیڑے کی تین سو کشتیاں بھی کام میں لائی گئیں۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے ولندیزی، فرانسیسی اور انگریزی کمپنیوں نے بھی حکومت کی بھرپور مدد کی یہاں تک کہ اسلام آباد اور جفنہ کے علاقوں کو پرتگالیوں کی دست برد سے رہا کرا لیا گیا۔ یہ ایکشن ۱۶۵۸ء میں لیا گیا.

(السادتی تاریخ المسلمین فی شبہ القارۃ الہندیہ، ج ۲، ص ۱۹۳، الشبال، تاریخ دولۃ اباطرۃ المغول الاسلامیہ فی الہند، ص ۱۴۰، ص ۱۵۷)

پرتگالیوں نے ۱۵۳۰ء میں گوا پر قبضہ کیا اور قبضہ کرتے ہی انہوں نے گوا میں اندلس کی طرز پر ایک ایسی عدالت قائم کر دی جو لوگوں کے عقائد وخیالات کی چھان بین کر کے زبردستی ان کو عیسائیت کے دائرہ میں داخل کرتی اور جو داخل ہونے سے انکار کرتے ان کے ساتھ انتہائی وحشیانہ سلوک کیا جاتا۔ کم سن بچے، بچیوں اور یتیم بچوں کو اغوا کر کے عیسائی مراکز میں رکھا جاتا اور کچھ عرصہ کے بعد انہیں پرتگال کی راجدھانی لزبن بھیج دیا جاتا جہاں انہیں باقاعدہ عیسائی بنا لیا جاتا۔

(السادتی تاریخ المسلمین فی شبہ القارۃ الہندیہ ج ۲، ص ۱۹۱)

اس طرح گوا کے صرف ایک علاقہ سے تین سال کے قلیل عرصہ میں چھ ہزار ایسے بچے اغوا کر کے لزبن بھیج دیئے گئے۔ انتہا یہ ہے کہ انہوں نے ممتاز محل کی دو خادماؤں کو بھی اغوا کیا اور انہیں بھی لزبن بھیج دیا.

اگرچہ پرتگالی اس طریقہ سے لوگوں کو عیسائی بنا رہے تھے، لیکن انہیں اس بات کا پورا احساس تھا

کہ یہ طریقہ غلط ہے اور اس طرح انہیں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہو رہی، خصوصاً برہمنوں نے ابھی تک معقول تعداد میں عیسائیت کو قبول نہیں کیا تھا، اور اگر یہ قبول کر لیں تو پھر تمام ہندو ہمارے دین کو قبول کر لیں گے۔ (لکان جمیع وثنیین قدا عتنقوا دیننا. (السادتی، ص ۲/۱۹۱)

پھر ۱۵۵۹ء میں یہ فرمان جاری ہوا کہ تمام پرتگالی مقبوضہ علاقوں میں طبی خدمات صرف عیسائی ہی سرانجام دیں گے۔ سرکاری عہدہ کے اہل صرف عیسائی ہیں۔ جو ہندو بچے یتیم ہو جائیں گے ان کی نگرانی اور تربیت بھی عیسائیوں کے ذمہ ہو گی۔ اور عیسائی پادریوں کو یہ اختیار دے دیا گیا کہ وہ گوا کے تمام علاقوں سے غیر عیسائیوں میں سے جس کو چاہیں، بے دخل کر سکتے ہیں۔ اس حکم اور تفویض کے مطابق واسکوڈی گاما نے ان سینکڑوں مسلمانوں کو سمندر میں غرق کروا دیا جو حج بیت اللہ کے ارادہ سے جہازوں پر سوار ہو کر حجاز مقدس جانا چاہتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان پرتگالی عیسائیوں میں اس قدر مذہبی تعصب تھا کہ وہ کسی غیر عیسائی کو زندہ دیکھنا پسند ہی نہیں کرتے تھے۔ خصوصاً مسلمانوں سے ان کو خاص عداوت تھی کیونکہ وہ ان کو اپنا براہ راست حریف سمجھتے تھے۔ ایک پادری نے جس نے گوا میں بہت ظلم ڈھائے اپنے پرتگالی بادشاہ کو ایک خط میں بڑے فخر سے لکھا:

''میں نے شہر میں کسی مسلمان کی جائیداد قائم و سالم نہیں رہنے دی۔ جو مسلمان بھی میرے ہاتھ لگ جاتے ہیں میں انہیں زندہ جلا دینے کا حکم دیتا ہوں''.

(صور من الاستعمار، ص ٦٩)

''1555ء میں کاناکور شہر میں نو ہزار مسلمانوں کو قتل کر کے ان کے پالتو جانوروں کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ نیز ان کے چالیس ہزار درختوں کو کاٹ کر جلا دیا گیا۔'' (صور من الاستعمار، ص ۳۸)

ظلم جب حد سے بڑھ جاتا ہے تو پھر مظلوموں کے دل میں ظالموں کے خلاف نفرت کا لاوا پکنا شروع ہو جاتا ہے۔ اس نفرت کو پھر نہ بندوقوں کی گولیاں، جیل کی کوٹھریاں اور پھانسی کے

پھندے ختم کر سکتے ہیں اور نہ ظلم وستم کا کوئی اور حربہ۔ گوا کے پرتگالی حکمرانوں کو بڑی دیر کے بعد احساس ہوا کہ اپنے ماتحتوں اور زیر دستوں کے ساتھ ان کا رویہ نہایت شرم ناک بلکہ افسوس ناک ہے۔ لوگوں کو عیسائی بنانے میں جو طریقہ انہوں نے اختیار کیا ہوا ہے وہ سراسر غلط ہے اور رعایا کے قلب ونظر پر اس کے اثرات پڑ رہے ہیں، لہٰذا جبر وتشدد کے ان طریقوں کو ختم کیا جائے اور شفقت ومحبت کی نیو پر دعوت کی عمارت کو کھڑا کیا جائے۔ لیکن لزبن کے حکمرانوں کے دل ودماغ پر خون سوار تھا۔ انہوں نے ان سفارشات کو درخواست اعتنا نہ سمجھا اور ظلم وتشدد کے تمام حربے جاری رکھنے کی ہدایت دی۔ حکمرانوں نے خزاں سے بہار چھین کر گل وگل چین کے رشتہ کبینیاد اٹھانے کی کوشش کی تھی، انہیں سوائے مایوسی کے اور کچھ نہ ملا۔ لہٰذا حالات میں کوئی سدھار پیدا نہ ہوا۔ غیر ملکی حکمران غلام رعایا کے ساتھ باہم دست وگریبان رہے، آدمی کے لہو سے آدمیت کی ذلت چمکنے لگی۔ دلوں کے انگارے بدبو دینے لگے اور خار مغیلاں بھی خون انسانی سے لالہ وگل کی رنگت حاصل کرنے لگے۔

۲۔ انگریزوں کی داستان ظلم:

یہ تو پرتگالیوں کی داستان ظلم کی چند جھلکیاں تھیں، جو انہوں نے فروغ عیسائیت کے لیے کیے۔ انگریزوں نے ہندوستان کے ساتھ لوگوں کو مرعوب کرنے اور اپنے دین کی نشر واشاعت کے لیے جو کچھ کیا، وہ داستان ظلم بھی اس سے مختلف نہیں ہے۔ انگریزوں کے ہندوستان میں وارد ہونے پر اگرچہ بہت سے غدارانِ وطن نے جو بعد میں جاگیردار اور بڑے بڑے زمیندار کہلائے، ان کا ساتھ دیا اور پوری ہندستانی قوم کو انگریزوں کے پنجۂ استبداد میں جکڑنے کی سرتوڑ کوشش کی، لیکن جب قفس کی تیلیاں ٹوٹیں تو بہاران سے روٹھ چکی تھی اور شبنم کے آنسو ہچکیاں لے رہے تھے۔ بادنسیم موت کی مضراب لے کر ان کے استقبال کو آئی اور ان لوگوں نے قوم سے غداری کر کے اور غیر ملکی حکمرانوں کا ساتھ دے کر غیر معینہ وقت کے لیے اہل وطن کو غلامی کے لیے پابند سلاسل کر دیا۔

پرتگالیوں نے یورپ میں ہندوستان کی زرخیزی وشادابی اور خوش حالی کا زبردست

پروپیگینڈہ کیا تھا، جس کی وجہ سے کئی ملکوں اور کئی لوگوں کے منہ سے رال ٹپکنے لگی۔ پرتگالیوں نے یہ خوش خبری بھی عیسائی دنیا کو دی کہ وہاں عیسائیت کے فروغ اور اس کی نشر و اشاعت کے سنہرے مواقع ہیں۔ ان خبروں کے سننے کے بعد یورپی قزاقوں نے بڑی تعداد میں ہندوستان کا رخ کیا تاکہ اس سونے کی چڑیا پر جلد از جلد قبضہ کرسکیں۔ چنانچہ پرتگالیوں کے علاوہ ولندیزی اور فرانسیسی بھی یہاں وارد ہوگئے لیکن آخر میں انگریزوں نے ان سب کا پتہ کاٹ دیا اور خود بلاشرکت غیرے ہندوستان کے مالک بن گئے۔

سب سے پہلا انگریز جس نے سرزمین پاک و ہند پر قدم رکھا تھا وہ پادری تھامس سٹیفنز (Thomas Stephenes) تھا، جو 1579ء میں گوا آیا تھا، پھر تین اور انگریز ہندوستان آئے اور انہوں نے 1599ء میں شہنشاہ اکبر کے عہد حکومت میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی بنیاد رکھی۔ 1608ء میں ولیم ہاکنز برطانوی سفیر بن کر ہندوستان آیا۔ اس نے برطانوی سفیر کی حیثیت سے انگلستان کے بادشاہ جمیز اول کا خط شہنشاہ جہانگیر کی خدمت میں پیش کیا، جس میں انگریزوں کو ہندوستان میں تجارتی سہولتیں دینے کی درخواست کی گئی تھی جو مسترد ہوگئی۔ بعد میں تھامس رو 1612ء میں انگلستان کے بادشاہ کا پیغام دوبارہ لے کر آیا تو انہیں یہاں فیکٹری لگانے اور تجارت کرنے کی اجازت مل گئی۔ اس کے بعد ان کے کارخانے اور فیکٹریاں پورے ہندوستان میں پھیلتی گئیں اور پھر غدر و خیانت اور مکر و خباثت سے انہوں نے آہستہ آہستہ پورے ہندوستان پر اپنے قدم جمالیے۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو جۃ الاستعمار: ص ۲۱۲، نشأۃ باکستان: ص ۳۰، تاریخ المسلمین فی شبہ القارۃ الہندیہ: جلد ۲ ۱۸۱، ۱۸۴، ۲۳۵، ۲۴۸، حقائق عن باکستان: ص ۲۷)۔

انگریزوں نے نہایت خاموشی کے ساتھ پورے ملک میں گرجا گھر، تعلیمی ادارے، ہسپتال اور شفاخانے قائم کر لیے۔ 1792-1795ء اور 1799ء میں مختلف ناموں سے تبلیغ کی انجمنیں قائم کر دی گئیں اور یورپ، امریکہ، جرمنی اور دوسرے یورپی ملکوں سے عیسائی مشنریز نے ہندوستان پر یورش کر دی۔ پھر عیسائی دانشور اور مبلغوں نے یہ فیصلہ کیا کہ کم سن بچوں کو خرید کر یا

زبردستی اغوا کر کے انہیں عیسائی بنایا جائے۔

اب مسلمانوں میں عیسائی دعوت کی سرگرمیاں تیز تر ہوگئیں۔ اسلامی عقائد، شخصیات، تہذیب اور تاریخ کے ساتھ قرآن حکیم اور ذات پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو شکوک وشبہات کا نشانہ بنایا گیا۔ یہ جدوجہد زیادہ تر دیہی علاقوں کے سادہ دل مسلمانوں میں مرکوز رکھی گئی تاکہ ان کے اسلامی عقائد متزلزل ہو جائیں اور آسانی کے ساتھ عیسائیوں کے جال میں پھنس جائیں۔ شروع شروع میں عیسائی مشنریز کو ایسٹ انڈیا کمپنی کی زبردست تائید اور حمایت حاصل رہی۔ 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد حکومت نے سرکاری سطح پر یہ کام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ لارڈ منٹو کے عہد میں عیسائی مشنریز کے خلاف فساد میں تیس انگریز مارے گئے۔ اس پر حکومت برطانیہ نے مشنریز جدوجہد اور سرگرمیاں تیز تر کرنے اور ان میں نظم ونسق پیدا کرنے کے لیے یہ حکم جاری کیا کہ ہندوستان میں تبلیغ کے لیے وہی مبلغ جاسکتا ہے جس کے پاس حکومت کا آرڈر ہو۔ 1857ء کے بعد پورے ہندوستان پر انگریزوں کا سیاسی اقتدار تھا لہٰذا ان کی دلی خواہش تھی کہ اب سرزمین اندلس کی طرح یہ خطہ بھی عیسائیت کی اکثریت والا علاقہ بن جائے۔ ہندوستان کی سرزمین میں انہیں اندلس سے زیادہ دلچسپی اور چارم (Charm) نظر آتا تھا، لہٰذا وائسرائے ہند لارڈ ڈیٹنگ نے اس بات کا عہد کیا کہ تین سال کے اندر پورے ہندوستان کو عیسائی اکثریت میں تبدیل کر دیا جائے گا۔ ادھر انگلستان میں ایک برطانوی ممبر پارلیمنٹ نے جنگ آزادی کے بعد اس بات کا اظہار کیا کہ

''آج سے پورا ہندوستان انگریزوں کے زیرنگیں ہے۔ اب پورے ملک پر مسیحیت کا پرچم لہرایا جائے گا۔ اب ہم تمام عیسائیوں کا یہ بنیادی فریضہ ہے کہ ہندوستان کو عیسائی بنانے کے لیے سرگرم عمل ہو جائیں''۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تاریخ دولۃ الاباطرہ المغول الاسلامیہ: ص ۱۶۲، نورالدین داؤد: محنۃ فی الفردوس: ص ۱۸۶، عبدالمنعم نمر: تاریخ الاسلام فی الہند: ص ۴۰۴، السادتی: تاریخ المسلمین فی شبہ القارۃ الہندیہ: جلد ۲ ص ۲۷۱، ص ۲۸۲، انور الجندی: العالم الاسلامی والاستعمار: ص ۱۵۳، عبدالعزیز نوار: الشعوب الاسلامیہ: ص ۵۸۴۔۵۵۵، عبداللہ حسین: المسالۃ الہندیہ: ص ۲۰۵، ۲۰۷ وغیرہم)۔

صلیبی جنگوں کی ناکامی کے بعد مسیحی دنیا نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف انتقام کے لیے جو منصوبہ بندی کی تھی، اس کا کرتا دھرتا اسپینی پادری ریمون للی (Raymn lilly) تھا جس نے اسپین میں مسلمانوں کو نہ صرف نیست و نابود کیا بلکہ ان کے وجود ہی کو تحلیل کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا۔ ریمون للی نے پاپائے روم کے سامنے جو منصوبہ پیش کیا اس میں گرجا گھروں سے اس بات کا مطالبہ کیا گیا تھا کہ تعلیمی اور ثقافتی مراکز کو عیسائی دعوت کی نشر و اشاعت اور تبلیغ مذہب کے لیے استعمال کیا جائے۔ اگر تعلیم و تربیت کے تمام وسائل استعمال کرنے کے بعد بھی مسلمان عیسائی نہ بنیں تو بجر و اکراہ یعنی جس طریقہ سے بھی ہو سکے انہیں عیسائی بنایا جائے.

عیسائیت کو تعلیمی اداروں اور ہسپتالوں کے ذریعہ بھی لانے کی کوشش کی گئی۔ ان عیسائی ہسپتالوں میں کام کرنے والی نرسوں کے فرائض میں یہ بھی شامل تھا کہ سال میں کم از کم چھ ہزار خاندانوں سے ذاتی روابط پیدا کریں۔ سالانہ تیس ہزار خواتین کے مفت علاج کی سہولت بھی ان ہسپتالوں میں مہیا کی گئی تھی۔ غرضیکہ ہر طریقہ سے عیسائیت کی نشر و اشاعت کی گئی.

انگریزی زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے اور نئے نصاب تعلیم کے نافذ ہونے کے بعد انگریزی حکومت کو ایسے افراد ملنے شروع ہو گئے جو ذہن و فکر اور ذوق و مزاج کے اعتبار سے نیم انگریز تھے اور جو دین اور اخلاقی قدروں کا مذاق اڑانے کو فیشن سمجھتے تھے۔ ان لوگوں کے ذریعہ اسلامی عقائد اور اسلامی تاریخ و تہذیب کو بے اعتبار ثابت کرنے کی ایک خاص مہم چلائی گئی تا کہ اسلامی عقائد کی عمارت میں دراڑیں بھی پڑ جائیں اور ہم پر کوئی حرف بھی نہ آئے۔ چنانچہ یہ مہم کامیاب رہی۔ ایک پادری نے ایک خط میں لکھا ہے:

> ''ہم ہندوستان اس لیے نہیں آئے کہ یہاں کے باشندوں کے ساتھ کوئی بھلائی کریں بلکہ ہم نے ان پر ایسا تعلیمی نظام مسلط کر دیا ہے جو رفتہ رفتہ ان کی دینی اور اخلاقی اقدار کو ختم کر کے زوال کے آخری درجہ تک انہیں پہنچا دے گا''.

یہ وقت مسلمانوں کے لیے بہت نازک تھا کیونکہ ان کی حکومت تو چھینی جا چکی تھی اب دین بھی

چھینا جارہا تھا۔ چنانچہ مولانا الطاف حسین حالی نے اس وقت کی نزاکت کو یوں بیان کیا ہے:

''ہندوستان میں اسلام خطروں میں گھرا ہوا تھا۔ ایک طرف مشنری گھات میں لگے ہوئے تھے اگرچہ قحط کے دوران میں ان کو دبلا پتلا شکار پیٹ بھراؤ مل جاتا تھا، مگر وہ اس پر قانع نہ تھے اور ہمیشہ صید فربہ کی تلاش میں رہتے تھے۔ ہندوستان میں سب سے زیادہ زوران کا مسلمانوں پر تھا، اس لیے کہ ان کی منادیوں میں، ان کے اخباروں میں اور ان کے رسالوں میں زیادہ تر بوچھاڑ اسلام پر ہوتی تھی۔ اسلام کی تعلیم کی طرح طرح سے برائیاں ظاہر کرتے تھے۔ بانیٔ اسلام کے اخلاق وعادات پر انواع واقسام کی نکتہ چینیاں کرتے تھے۔ بہت سے مسلمان کچھ ناواقفیت اور بے علمی کے سبب اور اکثر افلاس کے سبب ان کے دام میں آ گئے۔ اس خطرہ سے بلاشبہ علماء اسلام جیسے آل حسنؒ مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ اور ڈاکٹر وزیر خانؒ وغیرہ متنبہ ہوئے۔ انہوں نے متعدد کتابیں عیسائیوں کے مقابلہ میں لکھیں اور ان سے بالمشافہ مناظرے کیے جس سے یقیناً مسلمانوں کو فائدہ پہنچا۔ ردنصاریٰ میں تالیف وتصنیف اور پادریوں سے مقابلہ ومناظرہ کا سلسلہ جماعتی نہ سہی، لیکن انتظامی شکل میں شروع ہوگیا تھا۔ قدرتی طور پر ہر جگہ مسجدیں تھیں۔ علمائے کرام کے وہ گڑھ تھے۔ اس انقلابی تحریک کے چلنے میں کوئی دشواری پیدا نہ ہوئی۔ راہ نما کی ضرورت تھی۔ حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ سے بہتر کون ثابت ہوسکتا تھا۔ انہوں نے اس کی بنیاد ڈالی اور اس کام کے لیے دہلی اور آگرہ کو مرکز قرار دیا۔ یہاں بھی مولانا نے تصنیف وتالیف کا کام کیا۔ ان کی جماعت میں ہندوستان کے انتہا پسند اور حضرت مولانا اسماعیل شہیدؒ کے فدائی مسلمان تھے جن کی تعداد کافی تھی''۔ (حیات جاوید: ص ۴۸)

اسی طرح حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ نے بھی اس زمانہ کے حالات کا ایک نقشہ حیات شبلیؒ کے دیباچہ میں پیش کیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت مسلمانوں پر فتنوں کی آندھیاں چل رہی تھیں۔ سید صاحبؒ لکھتے ہیں:

''انگریزوں کے برسرعروج آتے ہی تین اطراف سے حملوں کا آغاز ہوا۔ چنانچہ مشنریوں نے اپنی نئی سیاسی طاقت کے بل بوتے پر اسلام کے قلعہ روئیں پر حملے شروع کر دیئے۔ دوسری طرف ہندوؤں میں آریہ تحریک نے اپنے سابق مسلمان حکمرانوں سے نجات پا کر ان پر حملہ کی جرأت پائی اور سب سے آخر میں یورپین علوم وفنون اور تمدن کی ظاہری چمک دمک مسلمانوں کی آنکھوں کو خیرہ کرنے لگی۔ خدا نے عیسائیوں کے مقابلے کے لیے مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ، ڈاکٹر وزیر خان (آگرہ) اور اس کے بعد مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا رحم علی منگلوریؒ، مولانا عنایت رسول چڑیا کوٹیؒ اور مولانا سید محمد علی مونگیریؒ وغیرہ اشخاص پیدا کیے جنہوں نے عیسائیوں کے تمام اعتراضات کے پرزے اڑا دیئے، خصوصیت کے ساتھ ڈاکٹر وزیر خان صاحبؒ اور مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کا وجود تو ردّ عیسائیت کے باب میں تائید غیبی سے کم نہیں۔ اور کون باور کرسکتا ہے کہ اس وقت میں پادری فنڈز کے مقابلہ کے لیے ڈاکٹر وزیر خان جیسا آدمی پیدا ہوگا جو عیسائیوں کے تمام اسرار کا واقف اور ان کی مذہبی تصنیفات کا ماہر کامل اور عبرانی و یونانی کا ایسا واقف ہوگا جو عیسائیوں کو خود انہی کی تصنیفات سے ملزم ٹھیرائے گا اور مولانا رحمت اللہ کے ساتھ مل کر اسلام کی حفاظت کا ناقابل شکست قلعہ دم کے دم میں کھڑا کر دے گا''. (دیباچہ حیات شبلیؒ)

1857ء کے بعد انگریزی پالیسیاں:

جنگ آزادی 1857ء کی ناکامی سے قبل انگریزوں کی پالیسیاں اور تھیں اور جنگ آزادی میں ناکامی کے بعد کچھ اور ہوگئیں۔ اب ان کی ہر پالیسی عیسائیت کی نشرواشاعت اور مسلمانوں کو دین اسلام سے دور رکھنے کے لیے تھی۔ چنانچہ انہوں نے عربی، فارسی اور اردو کے بجائے انگریزی کی تعلیم کو لازمی قرار دیا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں ملک کے مختلف شہروں میں لارڈ ولیم بینٹنگ نے اسکول اور کالج قائم کیے۔

(شاتلیہ: الغارۃ علی العالم الاسلامی: ص ۸، نورالدین داؤد: محنۃ فی الفردوس: ص ۱۸۸)

1835ء میں لارڈ میکالے نے ماہر تعلیم ہونے کے ناطے ایک ایسا نظام تعلیم مرتب کیا جس میں اس نے یہ کہا کہ ہمیں ایسے لوگ چاہئیں جو ہمارے اور ہماری رعیت کے درمیان ترجمان کا کام دیں اور یہ لوگ ایسے ہونے چاہئیں جو رنگ وخون کے لحاظ سے تو ہندوستانی ہوں لیکن ذوق و رائے اور زبان وفکر کے لحاظ سے انگریز ہوں۔

(الاستاذ ابوالحسن علی الندوی: الصراع بین الفکرۃ الاسلامیہ والفکرۃ الغربیہ: ص ۱۶۷)

جہاں اسلامی زبانوں کو ختم کیا گیا وہاں ہندوستان کی قدیم زبانوں کے احیاء کی حوصلہ افزائی کی گئی تاکہ ہندوؤں کی تاریخ اور تمدن سامنے آسکے اور ان کے اور مسلمان کے درمیان فرقہ واریت کو ہوا دی جائے۔

(السید ابوالحسن علی الندوی: المسلمون فی الہند: ص ۱۱۲، العالم الاسلامی والاستعمار: ص ۳۶۳)

ماہرین تعلیم نے انگریزوں کو جو تعلیمی پالیسی اختیار کرنے کا مشورہ دیا، اس کے کیا نتائج برآمد ہوئے، اس کو بھی ایک انگریز مونیہ ولیمس کی زبان سے ملاحظہ فرمائیں:

''وہ (مسلمان) اپنی زبان کو خیر باد کہتے ہوئے اپنی ادبیات، فلسفہ اور دین کو حقیر سمجھتے ہیں اور ہماری تربیت سے جو انحطاط ہوتا ہے اس کا آخر ہم سے بدلہ لیتے ہیں۔''

(میجر بالو: History of education: ص ۷۰، ابوالحسن علی الندوی: الصراع بین الفکرۃ الاسلامیۃ والفکرۃ الغربیۃ: ص ۷۵)

اس انگریزی تعلیم نے مسلمانوں کے روحانی اور تاریخی ورثہ کو تباہ و برباد کر کے انگریزی تہذیب وثقافت میں رنگ دیا بلکہ مدغم کر دیا اور اجتماعی قوت کو نیست ونابود کر دیا۔ یہی انگریزوں کا مقصد تھا۔ چنانچہ ایک انگریز دانشور ماکولی نے اپنے باپ کے نام ایک خط میں یوں کہا ہے:

''اس تعلیم نے ہندوستان میں وہ اثر دکھایا کہ انگریزی جاننے والا ایک شخص بھی ایسا نہیں ملتا جو انگریزی جاننے کے بعد اپنے دین کی صداقت پر قائم رہا ہو''۔

(تاریخ الاسلام فی الہند عبدالمنعم نمبر، ص ۴۰۱)

مسٹر ہابسن (Hobson) ایک انگریزی ماہر تعلیم نے ان الفاظ میں اس تعلیم کے اثرات کا اعتراف کیا ہے:

''ہم (انگیز قوم) ہندوستان میں ہندوستانیوں کی خیریت اور بہودی کے لیے نہیں آئے بلکہ ہم نے یہاں مدارس وکلیات میں ایک ایسا نظام تعلیم رائج کر دیا ہے جس کا بتدریج یہ تقاضا ہے کہ وہ ان کی دینی اور اجتماعی زندگی کو خرافات کے طور پر ان کے سامنے پیش کرے اور انسانی حقوق کی پامالی کا باعث بنے۔'' (ھوبسون: الامیریالیہ: ص ۳۰۶)

اس طرح ان مدارس وکلیات کی تعلیم وتربیت کے ذریعہ سے مسلمانوں کے قلوب واذہان سے دینی اقدار کی عظمت کو نکال کر ان کو عیسائیت کے قریب تر کر دیا گیا یعنی اگر وہ عیسائی نہ بن سکے تو ان کو صحیح مسلمان بھی نہ رہنے دیا گیا۔

علماء پر سختی:

ہندوستان میں مشنریوں نے لوگوں کو عیسائی بنانے کے لیے جو یلغار کی اور ہر طریقہ سے لوگوں کو انگریزی مذہب اور انگریزی تہذیب وتمدن میں رنگنے کی کوشش کی تو مشنریوں کی یلغار اور انگریزی سامراج کی ملی بھگت سے پیدا ہونے والے خطرات علماء کی نظروں سے مخفی نہیں رہ سکتے تھے۔ علماء کی بصیرت اور ان کی دوررس نگاہوں نے فوراً اس فتنہ کو بھانپ لیا اور نہ صرف زبان وقلم سے بلکہ عملاً تیغ وتفنگ سے ان کے خلاف جہاد کرنے پر کمربستہ ہو گئے۔ علماء اگرچہ بے سروسامان تھے، نہ قالین ان کے پاؤں تلے تھے اور نہ چتر شاہی سر پر تھا، لیکن درویش جب تاج شاہی سے ٹکراتا ہے تو قباؤں کے پیوند ہی اس کا ساتھ دیتے ہیں۔ جنونِ شوق سے جب دیوانے جادہ پیمائی کو نکلتے ہیں تو بادِ سحرگاہی بادِ سموم سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے کہ ریت کے ذرات دیوانوں کی پیشوائی نہ کر سکیں، لیکن جن کے سامنے منزل ہوتی ہے وہ آبلہ پائی کے نشانوں پر سفر کرتے ہیں۔ زمانہ کی کوئی رکاوٹ ان کا راستہ نہیں روک سکتی اور نہ وقت کا کوئی فیصلہ ان سے متصادم ہوتا ہے۔ وہ راستہ کے ہر سنگِ گراں سے بچتے اور کبھی اسے پائے استحقار سے ٹھکراتے ہوئے اپنی منزل کی جانب رواں

دواں ہو جاتے ہیں۔ آبلہ پائی بھی انہیں سفر سے باز نہیں رکھ سکتی کیونکہ ان کی نگاہ نشان منزل پر ہوتی ہے۔ وہ یہ کہہ کر گزر جاتے ہیں کہ:

پاؤں کے چھالوں سے کانٹوں کی بجھائی میں نے پیاس
جس طرف کو میں چلا گویا کہ میخانہ چلا

بجلیاں اس کو راستہ دکھاتی ہیں، آسمان کے فرشتوں کو اس کی مدد کے لیے بھیجا جاتا ہے اور ہر ظلم وتشدد کو وہ خندہ پیشانی سے برداشت کرتا ہے.

انگریزوں کی اس پالیسی کے خلاف علماء نے بغیر کسی خوف وخطر کے فتویٰ دیا کہ انگریزوں کے ساتھ دوستانہ مراسم، تعاون اور مشنری اسکولوں میں مسلمان بچوں کو بھیجنا ناجائز ہے۔ علماء نے مساجد کے منبر اور مدارس کے پلیٹ فارم سے خطاب کر کے مسلمانوں کو اس مسئلہ کی سنگینی سے آگاہ کیا۔ اس معاملہ میں انگریزوں سے ٹکر لینے میں پیش پیش وہی علاقے رہے جن میں مسلمانوں کی آبادی زیادہ تھی۔ عقیدۂ توحید کے سرچشمہ سے پھوٹنے والی قوت کا مقابلہ کرنے میں انگریزوں کو سخت مشکل کا سامنا کرنا پڑا۔ چنانچہ ولیم ہنٹر نے اعتراف کیا ہے کہ انگریزوں کا اولین اور سخت مقابلہ کرنے والے علاقوں میں سرفہرست ہندوستان کے شمالی اور مغربی حصے آتے ہیں کیونکہ ان ہی علاقوں میں علماء نے سب سے پہلے جہاد کے واجب ہونے کا فتویٰ دیا تھا۔ بنگال کے مسلمانوں کا اس کے بعد نمبر آتا ہے۔

(عبدالعزیز نوار: الشعوب الاسلامیہ: ص ۵۵۹،: تاریخ الاسلام فی الہند عبدالمنعم نمر، ص ۲۴۸)

انگریزوں نے علماء کو بڑی آزمائشوں اور امتحانات میں ڈالا لیکن علماء بھی بڑے سخت جان نکلے۔ بڑی سختیاں برداشت کیں۔ تختۂ دار پر کھینچے گئے۔ کالے پانی بھیجے گئے۔ جیلوں کی کالی کوٹھڑیوں میں ظلم وتشدد کا کوئی حربہ ایسا نہ تھا جو ان پر آزمایا نہ گیا۔ ہر جیل ان کے لیے ابوغریب، گوانتاموبا کی جیل تھی۔ یہ سب کچھ برداشت کیا، کس کے لیے؟ صرف دین اسلام اور مسلمانوں کے ایمان کے تحفظ کے لیے۔ اپنا سارا جسم ظلم واستبداد اور سختیوں سے داغدار کروالیا لیکن اسلام کے

پاکیزہ اور شفاف دامن کو داغدار نہ ہونے دیا۔

قومیں جب اپنے دورِ انحطاط میں ہوتی ہیں تو ان میں فروختنی مال بڑھ جاتا ہے۔ چنانچہ کچھ ایسے لوگ بھی تھے جنھوں نے حکومت وقت سے فائدہ اٹھانے کی خاطر حقیقی اسلام کے دامن کو چھوڑ دیا اور جنس گراں مایہ سے جنس ارزاں میں تبدیل ہو گئے۔ متاع دنیا کے لیے آخرت کی حقیقی مسرتوں کو کھو دیا۔ انگریزوں نے دیکھا کہ مساجد اور مدارس کے اوقاف چھین لینے اور انہیں تاخت و تاراج کر دینے کے بعد بھی علماء کی دعوتی جدوجہد، اسلامی تعلیمات کی نشر و اشاعت، انگریزوں کے خلاف مسلمانوں کو صف آرا کرنے کی دعوت اور نورِ قرآن سے مستیز ہونے میں کچھ بھی فرق نہیں آیا، تو انہوں نے علماء پر عرصہ حیات مزید تنگ کرنے کی پالیسی پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ ان کو بدنام کرنے کے لیے ہر قسم کے حربے اختیار کیے گئے۔ خود علماء میں سے ایک گروہ ایسا پیدا کیا گیا جنہوں نے علمائے ربانی پر کفر کے فتوے لگائے اور ہر ممکنہ ذریعہ سے عوام میں ان کے وقار کو مجروح کیا گیا اور لوگوں میں ان کے خلاف نفرت و حقارت کے جذبات پیدا کیے گئے۔ اور اس بات کی ہر ممکن کوشش کی گئی کہ ان کی عزت و ناموس کو عوام میں داغدار کر دیا جائے تاکہ لوگ ان کی بات پر عمل نہ کریں اور ہمارے آقا انگریز کو اس سے کوئی گزند نہ پہنچے اور ان کی حکومت مضبوط اور مستحکم رہے۔

انگریزوں کی طرف سے علماء کو انگریزوں کی مخالفت سے باز رکھنے کے لیے دردناک سزائیں دی گئیں جن میں کسی قسم کے مقدمہ کی سماعت کے بغیر قید دائمی، جلاوطنی اور پھانسی جیسی سزائیں بھی شامل تھیں۔ جب کسی عالم دین سے جواب طلب کرنا ہوتا تو عدالت میں اس کو حاضر کیا جاتا۔ کوئی افسر قرآن حکیم اور حدیث کی کوئی کتاب لاتا۔ جہاد کے بارے میں آیات اور احادیث نکالی جاتیں۔ پھر وہ افسر اس عالم دین سے پوچھتا کہ ان آیات و احادیث کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟ اگر وہ عالم یہ جواب دیتا کہ یہ سب صحیح اور درست ہے تو وہ افسر کہتا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم ہمارے خلاف جہاد کرنے کو ضروری اَوْر واجب سمجھتے ہو۔ اس پر اس عالم دین کا موقف اگر یہ ہوتا کہ میں ایک گوشہ نشین انسان ہوں۔ ان آیات و احادیث کی صحت کا عقیدہ صرف اس لیے

ہے کہ یہ قرآن واحادیث میں وراد ہوئی ہیں تو اس کو چار روز کی مہلت دی جاتی۔ اس دوران اگر وہ اپنا موقف بدل لیتا اور کسی اخبار میں اپنے موقف کی تبدیلی کا اعلان کر دیتا تو اسے چھوڑ دیا جاتا، وگرنہ اسے تختہ دار پر چڑھا دیا جاتا، پھر دائمی جلاوطنی اس کا مقدر ہوتی۔ اس سے کم اس کے لیے اور کوئی سزا نہ ہوتی۔ اس طریقہ سے لنکا اور انڈیمان کے جزائر ایسے ہی بے گناہ ''مجرم علماء'' سے بھر گئے تھے۔ سی یون نے اپنی کتاب Muhamednism in Indin میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ایک انگریز مصنف ''بلنٹ'' نے لکھا ہے کہ

''شہرت پانے والے ہر مولوی پر حکومت کی سخت نگاہ ہوتی تھی۔ ہر طرح سے اس پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا جاتا تھا۔ اس پر بھی اگر وہ اپنے موقف پر قائم رہتا تو اسے جزائر انڈیمان میں جلاوطن کر دیا جاتا تھا''۔

(مسعود عالم الندوی: تاریخ دعوۃ الاسلامیۃ فی الھند: ص ۱۸۵، جمال الدین الافغانی: العروۃ الوثقیٰ: ص ۳۲۲، سید ابوالحسن علی الندوی: ربانیۃ ولا رہبانیۃ، نورالدین داؤد: محنۃ فی الفردوس: ۱۸۸)

علماء کے شوقِ شہادت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب ایک بار انگریز جج نے علماء کی ایک جماعت کو پھانسی دینے کا فیصلہ سنایا تو وہ علماء شہادت کے تصور سے بے انتہاء خوش ہوئے۔ انگریز جج کو یہ بات ہرگز پسند نہ تھی کہ اس کا کوئی فیصلہ ان کے لیے مسرور کن ہو۔ چنانچہ اس نے فوری طور پر اپنا فیصلہ بدل دیا اور کہا:

''اے باغیو! پھانسی تم کو بہت عزیز ہے۔ اللہ کی راہ میں موت کو تم شہادت تصور کرتے ہو۔ ہم نہیں چاہتے کہ ہمارے ذریعہ تمہاری کوئی امید برآئے یا ہم تمہارے لیے کسی خوشی اور مسرت کا باعث بنیں، لہٰذا ہم پھانسی کے حکم کو فوری طور پر منسوخ کرتے ہیں اور تمہیں جزائر لنکا میں دائمی جلاوطنی کا فیصلہ سناتے ہیں۔''

(عبدالمنعم نمر: کفاح المسلمین فی تحریر الھند: ص ۳۲۔۳۴، تاریخ الاسلام فی الھند، ص ۴۲۶، سید ابوالحسن علی الندوی: اذا ھبت ریح الایمان: ص ۱۹۴، ص ۲۰۰)

جو علماء تختۂ دار پر چڑھ گئے وہ تو ایک مرتبہ اذیت اٹھا کر اس عالم فانی سے عالم باقی کو انتقال کر گئے لیکن جن لوگوں کو مختلف سزائیں ہوئیں ان کو ہر روز ایک موت سے گزرنا پڑتا تھا جس طرح آج کل گوانتاموبا کے مجاہدین گذر رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک نام مولانا فضل حق خیر آبادیؒ کا ہے۔ آپ ایک یکتائے روزگار عالم تھے۔ مولانا خیر آبادیؒ نے اپنی تصنیف ''الثورۃ الہندیہ'' میں ہندوستان کے جیل خانوں، جزائر انڈیمان اور وہاں کے مصائب و تکالیف کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ مولانا مرحوم کو خود بھی کالے پانی کی سزا ہوئی تھی۔ مولاناؒ کو یہ سزا کیوں دی گئی؟ مولانا خیر آبادیؒ اس بارے میں فرماتے ہیں:

''ہر ممکن اذیت پہنچائی گئی اور قصور صرف یہ تھا کہ وہ ایمان و اسلام پر مضبوطی سے قائم رہے اور ان کا شمار علمائے اسلام میں ہوتا تھا۔'' (الثورۃ الہندیہ: ص ۴۱۷)

مولانا خیر آبادی مزید فرماتے ہیں:

''مکر و تلبیس سے جب نصاریٰ نے مجھے قید کر لیا تو ایک قید خانہ سے دوسرے قید خانہ اور ایک سخت زمین سے دوسری سخت زمین میں منتقل کرنا شروع کیا۔ مصیبت پر مصیبت اور غم پر غم پہنچایا۔ میرا جوتا اور لباس تک اتار کر موٹے اور سخت کپڑے پہنا دیئے۔ نرم بستر چھین کر خراب، سخت اور تکلیف دہ بچھونا حوالے کر دیا، گویا کانٹے بچھا دیئے گئے یا دہکتی ہوئی چنگاریاں ڈال دی گئی تھیں۔ میرے پاس لوٹا، پیالہ اور کوئی برتن تک نہیں چھوڑا۔ بخل سے ماش کی دال کھلائی اور گرم پانی پلایا۔ کوئی گرم جوش دوست تو کیا ملتا گرم جوش پانی دیا گیا۔ اس ضعیفی اور پیرانہ سالی میں ہر وقت اور ہر آن ذلت و توہین سے کام لیا گیا۔''

''پھر مجھے دریائے شور کے کنارے ایک ایسے پہاڑ پر پہنچا دیا گیا جس کی آب و ہوا ناموافق اور جہاں سورج سر پر ہی رہتا ہے۔ اس کی گھاٹیاں دشوار گزار، پیچ در پیچ جنہیں دریائے شور (جزیرہ انڈیمان) کی موجیں ڈھانپ لیتی ہیں۔ اس کی نسیم صبح بھی سموم سے زیادہ گرم، غذا حنظل سے زیادہ کڑوی اور زہر ہلاہل سے زیادہ مضر، اس کا پانی

سانپوں کے زہر سے زیادہ ضرر رساں۔ ہر کوٹھڑی پر چھپر تھا جس میں رنج و مرض بھرا ہوا تھا۔ میری آنکھوں کی طرح ان کی چھتیں ٹپکتی رہتی تھیں اور ان سے بدبو مہکتی رہتی تھی۔ امراض کی کثرت، بیماری عام، دوانا پیدا وار مشکل، خارش اور قوبا (قوبا ایک مرض کا نام ہے جس میں بدن کی کھال چھلنے اور پھلنے لگتی ہے) کا رواج عام، بیمار کے علاج، تندرست کے بقاء صحت اور زخم کے اندمال کی کوئی صورت نہیں۔ دنیا کی کوئی مصیبت یہاں کی مصیبتوں پر قیاس نہیں کی جا سکتی۔ یہاں کی معمولی بیماری بھی خطرناک، بخار موت کا پیغام، مرض سرسام اور برسام (دماغ کے پردوں کا ورم) ہلاکت کی علت تام ہے، اور کتنی ہی بیماریاں ایسی ہیں کہ طب کی کتابوں میں ان کا نام و نشان نہیں۔ ڈاکٹروں کی یہ حالت کہ مرض کچھ اور دوا کچھ اور، اور مرنے والوں کے ساتھ یہ سلوک کہ مردہ خاک روب کے حوالے کر دیا جاتا ہے جو اس کے کپڑے اتار کر ٹانگ پکڑ کر ریگ کے تودے میں دبا دیتا ہے۔ نہ غسل، نہ کفن، نہ دفن اور نہ نماز جنازہ۔ اگر میت کے ساتھ یہ سلوک نہ ہوتا تو یہاں کی مصیبتوں کے مقابلہ میں مرجانا سب سے بڑی آرزو ہوتی، اور اگر مذہباً خودکشی ممنوع نہ ہوتی تو قید و بند کی ان مصیبتوں سے نجات پا لینا بہت آسان تھا.''

''میں نہیں جانتا تھا کہ ان مصیبتوں سے کس طرح چھٹکارا ہو سکے گا۔ خارش اور قوبا میں مبتلا ہو جانا مصیبت بالائے مصیبت ہے۔ صبح و شام اس طرح بسر ہوتی ہے کہ تمام بدن زخموں سے چھلنی بن چکا ہے۔ روح کو تحلیل کر دینے والے درد اور تکلیف کے ساتھ زخموں میں اضافہ ہوتا رہتا ہے''. (الثورۃ الہندیہ: ص ۴۲۱-۴۲۲)

حضرت مولانا فضل حق خیر آبادیؒ کو پہلے صفائی کے کام پر لگایا گیا تھا۔ برہنہ پا، صرف ایک لنگی اور کمبل کا کرتہ۔ کوڑا کرکٹ صاف کرتے اور ٹوکرے میں اکٹھا کر کے پھینک آتے۔ پھر کچھ دنوں بعد آپ کو محرری کے کام پر لگا دیا گیا، اور اس تبدیلی کا سبب آپ کا علمی تبحر تھا۔ صورت یہ

ہوئی کہ سپرنٹنڈنٹ کے پاس علم ہیئت کی ایک قلمی کتاب تھی۔ سپرنٹنڈنٹ کے یہاں ایک مولوی صاحب کام کرتے تھے۔ سپرنٹنڈنٹ نے وہ کتاب مولوی صاحب کو دی کہ اس کی غلطیاں درست کردیں۔ مولوی صاحب یہ کتاب مولانا خیرآبادیؒ کے پاس لے آئے۔ مولانا نے نہ صرف عبارتیں درست کیں بلکہ جگہ جگہ مضمون کی بھی تصحیح اور توضیح کردی اور کتابوں کے حوالے بھی اپنی یادداشت سے درج کردیئے۔ سپرنٹنڈنٹ کو جب مولانا کے علم وفضل کا احساس ہوا تو اس نے صفائی کی خدمت سے ہٹا کر محرری پر لگا دیا اور حکومت سے رہائی کی سفارش بھی کردی۔

علامہ فضل حق خیرآبادیؒ کے صاحبزادے مولانا شمس الحق اور خواجہ غلام غوث بیخبر میر منشی لیفٹیننٹ گورنر کی کوششیں برابر جاری رہیں۔ ادھر انڈیمان کے سپرنٹنڈنٹ جیل کی بھی سفارش تھی۔ نتیجہ میں کامیابی ہوئی یعنی آپ کی رہائی کا حکم ہوگیا، لیکن عجیب وغریب اور تکلیف دہ اور دل خراش صورت یہ پیدا ہوئی کہ مولانا شمس الحق پروانہ رہائی حاصل کر کے بڑی مشکلوں سے انڈیمان پہنچے۔ جہاز سے اتر کر شہر میں گئے تو ایک جنازہ نظر پڑا۔ اس کے ساتھ بڑا اژدہام تھا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ کل 14 صفر 1278ھ بمطابق 20 اگست 1861ء کو علامہ فضل حق خیرآبادیؒ کا انتقال ہوگیا ہے۔ اب ان کو سپرد خاک کرنے جا رہے ہیں۔ یہ بھی بصد حسرت ویاس شریک دفن ہوگئے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون۔ (علمائے ہند کا شاندار ماضی، مولانا محمد میاں: جلد۴ص۴۵۲)

یہ صرف ایک عالم دین کے مصائب کی مختصر داستان ہے ورنہ ان جیسے سینکڑوں نہیں ہزاروں علمائے دین نے ہم لوگوں کے کل کو بچانے کے لیے اپنا آج برباد کردیا۔ دین کے لیے ہنس کر مصائب کو گلے لگایا۔ تختۂ دار کو چوما اور دار ورسن کی مصیبتوں کو گلے لگایا تاکہ ہمارا ایمان محفوظ رہے، لیکن آج ہم نے ان کے تمام مصائب کو گلدستۂ طاق نسیان بنا دیا ہے۔ کتنے لوگ ہیں جو علامہ فضل حق خیرآبادیؒ اور ان جیسے دوسرے علماء کے ناموں سے واقف ہیں۔ ''تفو برتو اے چراغ گرداں تفو۔''

یہ ایک مختصر سا تذکرہ ہے جو ان حالات سے آشنا کرنے کے لیے حروف وسطور میں کچھ طویل

ہوگیا ہے۔ اس کی تفصیل احقر کی کتاب ''اسلام کی دعوتی قوت'' میں دیکھی جاسکتی ہے۔

یہ وہ حالات تھے جو انگریزوں نے سنہ 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد مسلمانوں کے لیے عموماً اور علمائے دین کے لیے خصوصاً برصغیر پاک و ہند میں پیدا کردیئے۔ یہ تاجروں کا روپ دھار کر آئے اور سو سال کے قلیل عرصہ میں پورے ہندوستان کے تاج و تخت پر مکمل طور پر قابض ہو گئے۔ ان کی تمام تر سیاست، ابلیسی سیاست'' تھی اور Devide and Rule کی پالیسی تھی۔ مصر کے مرحوم صدر جمال عبدالناصر نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ ''دریائے قلزم کی پنہائیوں میں اگر دو مچھلیاں بھی آپس میں لڑتی ہیں تو یقین کیجئے کہ اس میں بھی انگریز کی ابلیسی سیاست کارفرما ہوگی۔ انگریز کی یہ مکروہ پالیسی اب بھی پوری دنیا میں کارفرما ہے جس کی وجہ سے پاکستان سے سوڈان اور الجزائر تک تمام مسلمان ممالک اگرچہ ایک دوسرے سے مربوط ہیں لیکن اپنی جغرافیائی پیوستگی اور نظریاتی وابستگی اور یک جہتی کے باوجود جدا جدا ہیں۔ یہ سب فرنگی سیاست کے برگ و بار ہیں کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ جغرافیائی اور نظریاتی اتحاد کے ساتھ ساتھ اگر مسلمانوں میں سیاسی اتحاد بھی ہوگیا تو وہ پھر اتنی بڑی طاقت بن جائیں گے جس کو ختم کرنا مشکل ہوگا۔ اسی وجہ سے انگریزوں نے خلافت عثمانیہ کو ختم کیا کیونکہ اس سے انہیں مسلمانوں کے سیاسی اتحاد کے پیدا ہونے کا شدید خطرہ تھا۔ خلافت عثمانیہ کی شکست وریخت اور پھر اس کے بعد چھوٹی چھوٹی عرب ریاستوں کا قیام، جو لارنس آف عربیا کی معرفت وجود میں آیا، اعلان بالفور ہو یا ریڈکلف ایوارڈ، ایران کا بہائی فتنہ ہو یا ہندوستان کا قادیانی فتنہ، ان سب کے لیے انگریز نے اپنی ابلیسی سیاست سے وہی مہرے چنے جن کا فائدہ انگریز کو ہوا اور نقصان مسلمانوں کو۔ مسلمانوں کی آخری امید سلطان فتح علی ٹیپو تھا۔ اس نے مسلمانوں کی عظمت رفتہ کو واپس لانے کے لیے بڑی جرأت و بہادری سے جنگیں لڑیں لیکن خود اپنوں کی غداری سے ہندوستان کی عظمت کا چراغ ہمیشہ کے لیے گل ہوگیا اور عظمت رفتہ کو آواز دینے کے تمام دریچے قریباً قریباً بند ہو گئے، اور ہندوستان کا مسلمان ایک لحاظ سے انگریزی ظلم و استبداد سے خلاصی حاصل کرنے کے لیے مایوس ہوگیا، لیکن 1831ء میں حضرت سید احمد شہید بریلوی قدس سرہ کی تحریک

جہاد نے ان کے کان پھر کھڑے کر دیئے اور مسلمانوں کے دلوں میں پھر ایک مدہم سی لو جگمگائی، اور دیکھا یہ گیا کہ تھوڑے ہی عرصہ میں دہلی، لکھنؤ، میرٹھ، کانپور، اودھ، روہیل کھنڈ، بندیل کھنڈ اور گوالیار کے علاقے انگریزوں کے لیے آتش فشاں بن گئے۔ سلطنت انگلیسیہ کے لیے یہ ایک نہایت کٹھن وقت تھا، لیکن ہندوستان کے غدارانِ ازلی اور انگریزی حکومت کے کاسہ لیسوں نے پھر اس تحریک جہاد سے غداری کر کے انگریزی حکومت کو پھر استحکام بہم پہنچا دیا، اور پھر مسلمانوں کے ساتھ انگریزوں نے جو سلوک کیا وہ نہ صرف افسوس ناک ہے بلکہ شرم ناک بھی ہے۔ یہ دن مسلمانوں کے لیے نہایت مظلومی کے دن تھے جس کی کچھ تصویر کشی ہم نے گذشتہ سطور میں کی ہے۔ ہندوستان کا ذرہ ذرہ اشکبار ہوا، اداسی نے بال بکھیرے، آہوں نے دم توڑا، سسکیاں ہچکیوں میں تبدیل ہوئیں، عورتوں کی بے حرمتی ہوئی، اپنے بیگانے ہوے اور پھر کئی میر صادق اور میر جعفر پرویز مشرف پیدا ہو گئے، لیکن یہ سب کچھ ہونے کے باوجود علماء نے مسلمانوں کے دلوں سے جذبہ جہاد کو سرد نہ ہونے دیا، ان کے قلب ونظر کو فکر اسلامی سے معمور رکھا کیونکہ

مجھے یہ ڈر ہے دل زندہ تو نہ مر جائے
کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

اب انگریز کی ابلیسی سیاست نے ایک اور چال چلی۔ ایک طرف تو اس نے عیسائی مشنریز کو ملک میں درآمد کر کے مسلمانوں کے دین پر ہلہ بول دیا، اس ہلے میں عیسائی پادریوں کا میر لشکر پادری فنڈر تھا۔ دوسری طرف مسلمانوں کو مذہب کا شیدائی دیکھ کر اس نے ملک میں مناظروں اور مباحثوں کا یدھ رچا دیا، اور اب حالت یہ تھی کہ پورے ملک میں مسلمانوں اور عیسائیوں، مسلمانوں اور ہندوؤں، مسلمانوں اور آریوں کے درمیان مناظروں اور مباحثوں کا میدان گرم ہو گیا۔ اور پھر نوبت یہاں تک آ پہنچی کہ مسلمان آپس میں بھڑ گئے اور امکان نظیر اور امتناع نظیر، امکان کذب، رفع الیدین اور فاتحہ خلف الامام جیسے مسائل کو کھڑا کر کے مسلمانوں کو آپس میں بھڑا دیا۔ یہ سب کچھ مسلمانوں کو دین اسلام سے برگشتہ کرنے کے لیے اور ان کے دلوں

سے جذبۂ جہاد کو سرد کرنے کے لیے کیا گیا لیکن ان تمام باتوں کے باوجود وہ مسلمانوں کے دلوں سے جذبۂ جہاد کی اس چنگاڑی کو بجھا نہ سکا جو چودہ سو سال قبل سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کے دلوں میں لگائی تھی۔

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانش فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ میں خاک مدینہ و نجف

یہی وہ جذبہ جہاد تھا جو انگریزوں کو پریشان کیے ہوئے تھا (آج بھی امریکہ کو یہی جذبۂ جہاد پریشان کرر ہا ہے اور وہ مسلمان سربراہان مملکت کے ذریعہ اس کو اب دہشت گردی کا نام دلا رہا ہے)۔ یعنی جو کام انگریز کرنا چاہتا تھا وہ اب مسلمان سربراہانِ مملکت کر رہے ہیں۔ یعنی ''یہ وہ مسلماں ہیں جنھیں دیکھ کر شرمائیں یہود۔'') چنانچہ انگریزوں نے مسلمانوں کی مسلسل اور لگاتار کامیابیوں کے جواب اپنی کتابوں میں گنوائے ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے:

''مسلمانوں میں دینی سرگرمی بھی کام کرتی تھی۔ ان کا نظریہ یہ تھا کہ فتح پائی تو ''غازی'' کہلائیں گے اور حکومت حاصل ہوگی، اور اگر لڑتے ہوئے مرگئے تو شہید'' ہوں گے، اس لیے مرنا یا مارڈالنا بہت بہتر ہے پیٹھ دکھانے اور بیکار بیٹھنے سے''۔

(تاریخ برطانوی ہند: ص ۳۰۲، ۱۹۳۵ء)

جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد انگیزوں کی نئی پالیسی:

انگریز اگرچہ 1857ء کی جنگ آزادی میں سیاسی غداری پیدا کر کے کامیاب و کامران ہو گئے، لیکن اب انہیں اس بات کی فکر دامن گیر ہوئی کہ اس قبضہ میں استحکام (Stability) کیسے پیدا کیا جائے۔ اس زمانہ میں ذرائع مواصلات اتنے تیز نہ تھے جتنے کہ آج کل ہیں کہ ضرورت پڑنے پر فوری طور پر فوج مہیا کر دی جائے۔ ہندوستان کے باشندوں کی تعداد کروڑوں میں تھی، جب کہ اس کے مقابلہ میں انگریز ہزاروں یا لاکھوں میں تھے، اس لیے ہر وقت اس بات کا خطرہ تھا کہ بغاوت کا آتش فشاں پھر نہ پھٹ جائے۔ اور اگر یہ پھر پھٹ گیا تو اب مسلمان وہ غلطیاں نہ

دہرائیں گے جن کی وجہ سے ان کو پہلے شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ انگریز اس سے بڑا پریشان تھا کہ اس کا کیا مداوا کیا جائے۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے انہوں نے ایک وفد ترتیب دیا جس کا سربراہ ولیم ہنٹر تھا۔ یہ وفد 1869ء میں برطانوی دانشوروں، مدبروں اور عیسائی پادریوں پر مشتمل اس بات کا جائزہ لینے کے لیے ہندوستان آیا کہ کس طریقہ سے ہندوستانی مسلمانوں میں برطانوی حکومت سے وفاداری کا بیج بویا جا سکتا ہے اور مسلمانوں کو مطیع و منقاد اور رام کرنے کے لیے کون سی ترکیب استعمال کی جائے؟ یہ وفد پورا ایک سال ہندوستان میں رہا۔ مختلف لوگوں سے ملا، ان کے ذہن وفکر کا مطالعہ کیا، ان کے جذبات کو ٹٹولا۔ مذہبی راہ نماؤں سے بھی ملا اور سیاسی جغادریوں سے بھی۔ ہر ایک کے خیالات کا جائزہ لیا۔ ایک سال کی جدوجہد اور مطالعہ کے بعد جب 1870ء کے اواخر میں واپس انگلستان پہنچا۔ تو تمام حالات کا جائزہ لینے کے بعد 1870ء میں لندن میں اس وفد کا اجلاس ہوا جس میں ہندوستانی مشنری کے پادری بھی تھے۔ کمیشن کے سربراہ ولیم ہنٹر نے بتایا کہ ''مذہبی نقطۂ نظر سے مسلمان کسی دوسری حکومت کے زیر سایہ نہیں رہ سکتے۔'' ایسے حالات میں وہ جہاد کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ ان کا یہ جوش کسی وقت بھی انہیں ہمارے خلاف ابھار سکتا ہے''۔

اس وفد نے عنوان سے دو رپورٹیں لکھیں جس میں انہوں نے لکھا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی اکثریت اپنے روحانی اور مذہبی پیشواؤں کی اندھادھند پیروکار ہے۔ اگر کوئی ایسا شخص مل جائے جو الہامی سند پیش کرے تو ایسے شخص کو حکومت کی سرپرستی میں پروان چڑھا کر اس سے برطانوی مفادات کے لیے مفید کام لیا جا سکتا ہے۔ اس وفد کی رپورٹ کے الفاظ یہ تھے:

Majority of the population of the country blindly follow their "Peers" Their spiritual leaders. If at this stage, we succeed in finding out some who [illegible] be ready to declare himseef as Zilli nabi (apastolic propohet) then the large mumber of people shall relly round him. But for this purpose it is very difficult to persuade some one from the muslim masses.

If this problem is solved, the prophethood of such a person can flourish under the pastrange of the government, we have already overpowered the native government mainly pursuing a policy of seeking help from the traitors. It was a different stage, for at that time. The traitor were from the military point of view. But now when we have sway over every nook of the country and there is peace and order every where we ought to undertake measures which migt creat internal unrest among the country.

(Extrect from the report, India of life liberty, Index)

''یعنی ہندوستانی مسلمانوں کی اکثریت اپنے پیروں اور روحانی راہ نماؤں کی اندھی تقلید کرتی ہے۔ اگر اس موقع پر ہمیں کوئی ایسا شخص مل جائے جو ظلی نبوت (حواری نبی) کا اعلان کر کے اپنے گرد پیروکاروں کو اکٹھا کرے لیکن اس مقصد کے لیے اس کو عوام کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس شخص کی نبوت کو حکومت کی سرپرستی میں پروان چڑھا کر برطانوی حکومت کے لیے مفید کام لیا جا سکتا ہے۔ ہم نے مقامی حکومتوں کو پہلے ہی ایسی ہدایات دی ہوئی ہیں کہ غداروں سے معاونت حاصل کی جائے۔ اس وقت مسلح غداری ہوئی تھی تو صورت حال اور تھی، لیکن اب ہم نے ہندوستان کے طول و عرض میں بہتر انتظامات کر لیے ہیں۔ ملک میں ہر طرف امن و امان ہے۔ ملک کی اندرونی بدامنی سے نمٹنے کے لیے اقدامات کیے جا چکے ہیں''۔ (ماخوذ از رپورٹ: انڈیا آفس لائبریری، لندن)

انگریزوں کے لیے اس وقت جہاد کا مسئلہ سوہان روح بنا ہوا تھا کیونکہ اسی مسئلہ نے 1857ء کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کو انگریزوں کے خلاف کھڑا کر دیا تھا۔ اگرچہ انگریزوں نے اس وقت کچھ سیاسی غدار پیدا کر کے وہ جنگ تو جیت لی لیکن مسئلہ جہاد کے تحت پھر بھی مسلمانوں کی طرف سے بغاوت کا آتش فشاں ہر وقت پھٹنے کا احتمال تھا۔ چنانچہ کچھ علماء کو خرید کر یا بالجبران سے جہاد کے خلاف فتوے حاصل کیے گئے جن کا تذکرہ ولیم ہنٹر نے اپنی کتاب Our Indian Mussalmans (ہمارے ہندوستانی مسلمان) میں کیا ہے۔

۳۔ نبی کی تلاش:

ولیم ہنٹر اور اس کے وفد کی متفقہ رپورٹ کو ذہن میں رکھتے ہوئے برطانوی حکومت کو اب ایسے شخص کی تلاش شروع ہوئی جو برطانوی حکومت استحکام اور اس کے تحفظ کے لیے اور مستقبل کی بغاوت کے امکانات کو ختم کرنے کے لیے الہامات کا ڈھونگ رچائے۔ جو تاج برطانیہ کے تحفظ اور ملک برطانیہ کی مدح میں رطب اللسان ہو۔ ہر ضلع میں ایسے شخص کی تلاش شروع ہوئی۔ جوئندہ یابندہ کے اصول کے تحت سیالکوٹ کے ڈپٹی کمشنر نے منشی غلام احمد قادیانی کو بالآخر تلاش کر لیا۔ چنانچہ لکھا ہے کہ

''برطانوی ہند کی سنٹرل انٹیلی جنس کی رپورٹ کے مطابق ڈپٹی کمشنر سیالکوٹ نے چار اشخاص کو انٹرویو کے لیے طلب کیا، ان میں سے مرزا غلام احمد قادیانی نبوت کے لیے نامزد کیے گئے۔'' (تحریک ختم نبوت، ص ۲۱، شورش کاشمیری)

مرزا غلام احمد کو کیوں منتخب کیا گیا؟

مرزا غلام احمد کو دعویٰ نبوت کے لیے کیوں منتخب کیا گیا؟ اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ مرزا کی ابتدائی زندگی کے حالات کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے معمولی سی دینی تعلیم حاصل کی۔ اس کے والد مرزا غلام مرتضیٰ نے سکھوں کے عہد میں چھینی جانے والی جاگیروں کی بازیابی کے لیے مقدمات کر رکھے تھے۔ سب مال و دولت ان مقدمات پر خرچ کر دیا گیا حتیٰ کہ گھر میں غربت ناچنے لگی، مالی مصائب سے پریشان ہو کر اس نام کے رئیس قادیان نے 1864ء میں سیالکوٹ کی کچہری میں آٹھ آنے روز یعنی پندرہ روپے ماہوار پر اہل مد کی ملازمت حاصل کر لی۔ اس دوران اس نے یورپی مشنریوں اور بعض انگریز افسران سے تعلقات پیدا کر لیے۔

سیالکوٹ ہی میں ایک اور واقعہ مرزا غلام احمد کو پیش آیا جو اس کی زندگی میں سنگ میل ثابت ہوا۔ وہ پادری بٹلر کی لندن واپسی ہے۔ یہ پادری برطانوی انٹیلی جنس کا ایک اہم رکن تھا اور ہندوستان

میں مبلغ کے روپ میں کام کر رہا تھا۔ مرزا نے مذہبی مباحث کی آڑ میں اس سے طویل ملاقاتیں کیں۔ 1868ء میں بٹلر ولایت جانے سے قبل مرزا کے پاس آیا۔ خفیہ بات چیت ہوئی اور معاملات کو حتمی صورت دی گئی۔ مرزا کا بیٹا مرزا محمود اپنی کتاب ''سیرت مسیح موعود'' میں لکھتا ہے:

''ریورینڈ ربٹلر ایم۔ اے جو سیالکوٹ مشن میں کام کرتا تھا اور جن سے مرزا غلام احمد کے بہت سے مباحثات ہوتے رہتے تھے، جب ولایت واپس جانے لگے تو خود کچہری میں آپ کے پاس ملنے کے لیے چلا آیا، اور جب ڈپٹی کمشنر صاحب نے پوچھا: کس طرح تشریف لائے تو ریورنڈ مذکور نے کہا: ''صرف مرزا صاحب کی ملاقات کے لیے۔'' اور جہاں آپ بیٹھا تھا، وہیں سیدھے چلا گیا اور کچھ دیر بیٹھ کر واپس چلا گیا۔'' (سیرت مسیح موعود: ص ۱۵، ربوہ، مرزا محمود قادیانی)

اپنے ایک خطبے میں مرزا محمود نے اس واقعہ کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

''اس وقت پادریوں کا بہت رعب تھا، لیکن جب سیالکوٹ کا انچارج مشنری ولایت جانے لگا تو مرزا غلام احمد سے ملنے کے لیے خود کچہری آیا۔ ڈپٹی کمشنر اسے دیکھ کر اس کے استقبال کے لیے آیا اور دریافت کیا کہ ''آپ کس طرح تشریف لائے؟ کوئی کام ہو تو ارشاد فرمائیں؟'' مگر اس نے کہا: ''میں صرف آپ کے اس منشی سے ملنے آیا ہوں۔'' یہ ثبوت ہے اس امر کا کہ مرزا کے مخالف بھی تسلیم کرتے تھے کہ یہ ایک ایسا جوہر ہے جو قابل قدر ہے''۔ (اخبار الفضل، قادیان، ۲۴ اپریل ۱۹۳۴ء)

مسٹر بٹلر نے مرزا سے کیا باتیں کیں اور کیا منصوبہ اس کے ساتھ بنایا، مرزا کے بعد واقعات بتاتے ہیں کہ اسی نے مرزا کو دعوائے نبوت اور تنسیخ جہاد کے اعلان پر آمادہ کیا تھا۔ چنانچہ اسی سال 1864ء میں مرزا بغیر کسی معقول ظاہری وجہ کے اہل مد کی نوکری سے استعفیٰ دے کر قادیان چلا گیا اور تصنیف و تالیف کے کام میں لگ گیا۔

انگریز نہایت ہوشیار تھا۔ اس نے منشی غلام احمد قادیانی کا صحیح انتخاب کیا تھا۔ چنانچہ مرزا ہر لحاظ سے انگریز حکومت کی خدمت اور برطانوی مفادات کے تحفظ کے لیے نہایت موزوں اور

قابل اعتماد شخص تھا، کیونکہ ایک تو وہ مالی لحاظ سے کمزور ہونے کے ناطے ہر لحہ مال کا خواہش مند تھا دوسرے اس کا خاندان پرانا غدارانِ وطن میں سے تھا اور ابتدا ہی سے انگریزوں کی کاسہ لیسی اور برطانوی سامراج کی خدمت میں نہ صرف مشہور تھا بلکہ اس پر بڑا فخر کرتا تھا۔ چنانچہ مرزا کے والد مرزا غلام مرتضٰی نے جنگ آزادی میں مسلمانوں سے غداری کر کے انگریزوں کو 50 گھوڑے مع سواروں کے دیئے تھے جب کہ بڑے بھائی مرزا غلام قادر مشہور سفاک اور ظالم انگریز جنرل ولسن کی فوج میں رہا تھا اور اس نے مسلمانوں کے خون میں ہاتھ رنگے تھے۔ مرزا خود انگریزوں کی وفاداری اور تابعداری کا یوں اعتراف کرتا ہے:

''میں ایک ایسے خاندان سے ہوں جو اس گورنمنٹ کا پکا خیر خواہ ہے۔ میرا والد مرزا غلام مرتضٰی گورنمنٹ کی نظر میں ایک وفادار اور خیر خواہ آدمی تھا جس کو دربار گورنری میں کرسی ملتی تھی اور جن کا ذکر مسٹر گریفن کے ''تاریخ رئیسان پنجاب'' میں ہے اور 1857ء میں انہوں نے اپنی طاقت سے بڑھ کر سرکار انگریزی کو مدد دی تھی، یعنی پچاس سوار اور گھوڑے بہم پہنچا کر عین زمانہ غدر کے وقت سرکار انگریزی کی امداد میں دیئے تھے''.

(اشتہار واجب الاظہار منسلک کتاب البریہ، ص ۳، مرزا غلام احمد قادیانی)

اپنے باپ اور اپنے بھائی مرزا غلام قادر کی سرکار انگریزی کے حق میں خدمات کا اعتراف مرزا غلام احمد نے اور بھی کئی جگہ کیا ہے، بلکہ اپنی کتابوں میں وہ خطوط بھی نقل کیے ہیں جو اس نے وطن سے غداری اور تاج برطانیہ کی حمایت اور فاداری کے اعتراف میں بھیجے تھے۔ چنانچہ مسٹر ولسن نے مرزا غلام مرتضٰی کو اس کی خدمات کے اعتراف میں لکھا جس کو انگریزی میں مراز غلام احمد نے نقل کیا ہے پھر اردو میں اس کا ترجمہ بھی کیا ہے، جو حسب ذیل ہے:

مسٹر ولسن بنام مرزا غلام مرتضٰی رئیس قادیان

''میں نے آپ کی اس درخواست کا بغور مطالعہ کیا ہے جس میں آپ نے اپنی اور اپنے خاندان کی خدمات اور اس کے حقوق کی یاددہانی کرائی ہے۔ میں خوب جانتا ہوں، بلاشبہ

آپ اور آپ کا خاندان سرکار انگریزی کا جانثار، وفادار اور ثابت قدم خدمت گار رہا ہے، اور آپ کے حقوق یقیناً لائق توجہ ہیں۔ آپ بہرنوع تسلی وتشفی رکھیں۔ برٹش گورنمنٹ آپ کے خاندان کے حقوق وخدمات کو ہرگز فراموش نہ کرے گی اور جیسے کوئی مناسب موقع نکلا ان پر پوری توجہ دی جائے گی۔ آپ کو چاہیے کہ آپ بدستور حکومت کے جانثار وفادار ہیں کہ حکومت کی خوشنودی اور آپ کی بہبودی کا راز یہی ہے''۔ (مورخہ ۱۱جون ۱۸۳۹ء لاہور)

ایسا ہی رابرٹ کسٹ نے بھی 20 ستمبر 1858ء کو مرزا غلام مرتضٰی کو ایک خط لکھا تھا جس میں اس کی خدمات کو سراہا گیا، بلکہ دوسو روپیہ بھی خلعت کے طور پر عطا کیا گیا۔ پھر ایک اور خط مرزا غلام احمد نے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے جو فنانشل کمشنر پنجاب مسٹر رابرٹ ایجرٹن نے مرزا کے بھائی مرزا غلام قادر کو لکھا تھا جس میں مرقوم تھا:

میرے پیارے دوست غلام قادر

''میں نے آپ کا خط جو اس ماہ کی دو تاریخ کا لکھا ہوا تھا، پڑھا۔ مجھے آپ کے باپ، مرزا غلام مرتضٰی کی وفات کا از حد افسوس ہوا۔ وہ سرکار انگریزی کے اچھے خیر خواہ اور وفادار رئیس تھے۔ ہم آپ کی خاندانی لحاظ سے اسی طرح عزت کریں گے جس طرح آپ کے وفادار والد کی کی جاتی تھی۔ کوئی مناسب موقع نکلنے پر ہمیں آپ کے خاندان کی بہتری اور پابجائی کا خیال رہے گا''۔ (مورخہ ۲۹جون ۱۸۷۶ء)

یہ تمام خطوط مرزا غلام احمد کی کتاب البریہ سے منسلک اشتہار واجب الاظہار ۴، ۶ اور ۱۵ سے نقل کیے گئے۔ یہ خطوط بعض اور کتابوں میں بھی نقل کیے گئے ہیں تاکہ حکومت برطانیہ کو اپنی وفاداری اور خیر خواہی کا یقین دلایا جاسکے۔

ان خطوط کے نقل کرنے کے بعد مرزا قادیانی نے لکھا ہے:

''پھر میرے والد صاحب کی وفات کے بعد میرا بڑا بھائی مرزا غلام قادر خدمات سرکاری میں مصروف رہا اور جب تموّ کی راہ گذر پر مفسدوں کا سرکار انگریز کی فوج سے مقابلہ ہوا تو

وہ سرکار انگریزی کی طرف سے لڑائی میں شریک ہوئے''۔

(اشتہار واجب الاظہار: ص ۵ منسلک کتاب البریہ، مرزا غلام احمد قادیانی)

انگریزوں اور تاج برطانیہ کی اسی خیر خواہی کا نتیجہ تھا کہ مرزا غلام احمد نے دعوائے نبوت کر کے ایک تو تنسیخ کا اعلان جہاد کیا کیونکہ انگریز کو سب سے زیادہ اسی مسئلہ سے خطرہ تھا اور دوسرے اپنی جماعت اور دوسرے لوگوں کو اطاعت انگریز کا حکم دیا۔ گویا اس متنبی کی بعثت کے صرف دو ہی مقصد تھے (۱) تنسیخ جہاد اور (۲) اطاعت حکومت انگریزی۔ یہ دونوں کام مرزا غلام احمد نے خود بھی کیے اور اس کی اولاد اور پیروکار آج تک کر رہے ہیں۔ چنانچہ مرزا غلام احمد نے لکھا ہے:

''میں نے ممانعت جہاد اور انگریز کی اطاعت کے بارے میں اس قدر کتابیں لکھی ہیں اور اشتہار شائع کیے ہیں کہ اگر وہ رسائل اور کتابیں اکٹھی کی جائیں تو پچاس الماریاں ان سے بھر سکتی ہیں۔'' (تریاق القلوب، ص ۱۵، مرزا غلام احمد قادیانی)

اپنی ایک اور کتاب میں مرزا نے لکھا ہے کہ

''مجھ سے سرکار انگریزی کے حق میں جو خدمت ہوئی وہ یہ تھی کہ میں نے پچاس ہزار کے قریب کتابیں اور رسائل اور اشتہارات چھپوا کر اس ملک اور نیز دوسرے بلاد اسلام میں اس مضمون کے شائع کیے کہ گورنمنٹ انگریزی ہم مسلمانوں کی محسن ہے، لہٰذا ہر ایک مسلمان کا یہ فرض ہونا چاہیے کہ اس گورنمنٹ کی سچی اطاعت کرے اور دل سے اس دولت کا شکر گزار اور دعا گو رہے۔ اور یہ کتابیں میں نے مختلف زبانوں اردو، فارسی، عربی میں تالیف کر کے اسلام کے تمام ملکوں میں پھیلا دیں اور یہاں تک کہ اسلام کے دو مقدس شہروں مکے اور مدینے میں بھی بخوشی شائع کر دیں۔''

(ستارہ قیصرہ: ص ۷، مرزا غلام احمد)

ایک اور جگہ لکھا:

''میں بذات خود سترہ برس سے سرکار انگریزی کی ایک ایسی خدمت میں مشغول ہوں کہ

درحقیقت وہ ایک ایسی خیر خواہی گورنمنٹ عالیہ کی مجھ سے ہمیشہ سے یہ کوشش رہی ہے کہ مسلمان اس سلطنت (برطانیہ) کے سچے خیر خواہ ہو جائیں اور مہدی خونی اور مسیح خونی کی بے اصل روایتیں اور جہاد کے جوش دلانے والے مسائل جو احمقوں کے دلوں کو خراب کرتے ہیں، ان کے دلوں سے معدوم ہو جائیں''.

(تریاق القلوب، ص ۲۵، مرزا غلام احمد قادیانی)

''آج سے دین کے لیے لڑنا حرام کیا گیا۔ اب اس کے بعد جو دین کے لیے تلوار اٹھاتا ہے اور غازی نام رکھ کر کافروں کو قتل کرتا ہے، وہ خدا اور اس کے رسول کا نافرمان ہے''. (اشتہار چندہ منارۃ المسیح ص، ب، ت ضمیمہ خطبہ الہامیہ)

مرزا غلام احمد قادیانی اور اس کے پیروکاروں کو انگریزوں سے اس قدر محبت تھی اور اس محبت کے نتیجہ میں مسلمان ملکوں سے اتنی نفرت اور اس قدر بغض وعناد ہو گیا تھا کہ:

''جب پہلی جنگ عظیم میں ترکوں کو شکست ہوگئی، بغداد پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا تو قادیان میں اس فتح پر ''جشن مسرت'' منایا گیا.'' (منیر تحقیقاتی رپورٹ: ص ۲۰۸۔۲۰۹)

اسی وجہ سے بانیٔ قادیانیت نے اسلامی ممالک کا انگریزی حکومت کے ساتھ توہین آمیز انداز میں مقابلہ وموازنہ کیا ہے'' (منیر تحقیقاتی رپورٹ: ص ۲۰۸)

تنسیخ جہاد اور اسلامی ممالک کے ساتھ اس قدر نفرت انگیز رویہ کی وجہ سے علامہ اقبالؒ قادیانی تحریک کے بارے میں فرماتے ہیں:

''قادیانی تحریک فرنگی انقلاب کے حق میں الہامی سند بن کر سامنے آئی''.

(حرف اقبال، ص ۱۴۵، لطیف احمد شیروانی، ایم۔اے)

علامہ اقبالؒ کا تحریک قادیانیت کی طرف رجحان:

مرزا غلام احمد قادیانی اور اس کی جماعت کی سرگرمیوں کو علمائے دین بنظر غائر دیکھ رہے تھے کہ مرزا نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت پر جارحانہ حملہ کیا ہے اور مرزا نے بتدریج

دعوائے نبوت کر دیا ہے، سیدنا عیسیٰ علیہ الصلوۃ والسلام اور دوسرے انبیاء علیہم السلام کی توہین کی جا رہی ہے، جہاد جس کے بارے میں ارشاد نبوی ہے کہ ''الجهاد ماض الیٰ یوم القیامة'' ایک شخص انگریزوں کو خوش کرنے کے لیے اور ان سے مالی فوائد حاصل کرنے کے لیے، اس کو منسوخ اور حرام قرار دے رہا ہے اور علی الاعلان کہہ رہا ہے

اب چھوڑ دو جہاد کا اے دوستو خیال
دین کے لیے حرام ہے اب جنگ اور قتال

میں نے بیسیوں کتابیں عربی، فارسی اور اردو میں اس غرض سے تالیف کی ہیں کہ اس گورنمنٹ محسنہ سے ہرگز جہاد درست نہیں بلکہ سچے دل سے اطاعت کرنا ہر ایک مسلمان کا فرض ہے''

(عریضہ بعالی خدمت گورنمنٹ عالیہ انگریزی من جانب مرزا غلام احمد قادیانی۔ مندرجہ تبلیغ رسالت: جلد ۶ ص ۶۵)

''میں یقین رکھتا ہوں کہ جیسے جیسے میرے مرید بڑھیں گے ویسے ویسے مسئلہ جہاد کے معتقد کم ہوتے جائیں گے کیونکہ مجھے مسیح اور مہدی مان لینا ہی مسئلہ جہاد کا انکار کرنا ہے۔'' (تبلیغ رسالت: جلد ۷ ص ۱۷)

پھر اسی کتاب میں اپنی جماعت کو انگریز کا ''خود کاشتہ پودا'' قرار دیا۔ (تبلیغ رسالت: جلد ۷ ص ۱۹)

مرزا غلام احمد قادیانی نے انگریزوں کی مدح سرائی اور مسئلہ جہاد کے حرام ہونے پر جو کچھ لکھا، اس کو پڑھ کر بعض قادیانیوں کو بھی شرم محسوس ہوتی تھی کہ ایک مدعی نبوت اس ذلت آمیز لہجہ میں کافر حکومت کی مدح سرائی کرتا ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ مرزا محمود احمد نے اپنے خطبہ میں کہا:

''حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فخریہ لکھا ہے کہ میری کوئی کتاب ایسی نہیں جس میں میں نے گورنمنٹ کی تائید نہ کی ہو، مگر مجھے افسوس ہے کہ میں نے غیروں سے نہیں بلکہ احمدیوں سے یہ کہتے سنا ہے، میں انہیں احمدی ہی کہوں گا، کیونکہ نابینا بھی آخر انسان ہی کہلاتا ہے کہ ہمیں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ایسی تحریریں پڑھ کر شرم آ جاتی ہے۔ انہیں شرم کیوں آتی ہے، اس لیے کہ ان کے اندر کی آنکھ نہیں کھلی''۔

(اخبار الفضل قادیان مورخہ ۷ جولائی ۱۹۳۲ء)

قادیانی جماعت کی بنیاد دو چیزوں پر ہے مسئلہ جہاد کو حرام قرار دینا اور انگریزوں کی اطاعت کرانا۔ اور آج بھی وہ تنسیخ جہاد کے عقیدے پر قائم ہیں۔ چنانچہ مرزا ناصر احمد، قادیانی خلیفہ کے دورہ افریقہ کی رپورٹ Africa Speaks کے نام سے شائع ہوئی، اس میں لکھا ہے

یعنی مرزا غلام احمد کے اہم معتقدات میں سے ایک جہاد کا انکار ہے۔ اور یہ سب کچھ انگریزوں کی حکومت کو مضبوط رکھنے کے لیے کیا جا رہا ہے۔ حکومت کی سرپرستی میں اس کو روز بروز ترقی حاصل ہو رہی ہے۔ صرف مناظروں یا وعظوں سے اس کی تردید کافی نہیں بلکہ جدید پڑھا لکھا طبقہ بھی اس کی تردید میں اخبارات میں مضامین لکھے اور لوگوں کو اس کے مالہ و ماعلیہ سے آشنا کرے۔ یہ خیالات جس بزرگ ہستی کے ذہن میں اٹھکیلیاں لے رہے تھے وہ دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث امام العصر علامہ سید انور شاہ کشمیریؒ تھے، غور و فکر کے بعد جدید طبقہ میں انہیں ایک ہستی نظر آئی جو ان تمام امور کو سمجھ بھی سکتی تھی اور ان کے بارے میں جدید اور قدیم نظریات کی روشنی میں لکھ بھی سکتی تھی۔ چنانچہ ایک روز وہ نحیف و نزار شخصیت دیوبند سے لاہور پہنچی اور حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے مرید باصفا ڈاکٹر جلال الدین ڈینٹل سرجن کے ہاں قیام فرمایا۔ چنانچہ ڈاکٹر جلال الدین صاحب کا بیان ہے کہ

''ایک دن نحیف و ناتواں جسم، ہڈیوں کا مجموعہ لیکن چہرہ پر ایمان کی روشنی، قندیلوں کی جھلکار، حسین و جمیل انسان میری دکان پر (یعنی ڈاکٹر جلال الدین صاحبؒ کی دوکان پر) تانگہ سے اترا۔ میں نے بڑھ کر دیکھا کہ وہ مولانا سید محمد انور شاہ کشمیریؒ تھے۔ مولانا کشمیریؒ نے ڈاکٹر جلال الدین سے فرمایا کہ مجھے علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ سے ملنا ہے۔ ڈاکٹر جلال الدین صاحبؒ نے ڈاکٹر علامہ اقبال سے وقت لیا۔ شاہ صاحبؒ نے علامہ صاحب سے تین گھنٹے علیحدگی میں بات کی۔ واپس ہوئے تو ڈاکٹر جلال الدین نے شاہ صاحبؒ سے پوچھا کہ حضرت اتنی نقاہت اور کمزوری کے باوجود یہ سفر کیوں کیا؟ فرمایا کہ علامہ ڈاکٹر محمد اقبال کا پڑھے لکھے لوگوں پر اچھا اثر ہے، ان کو تیار کرنے آیا تھا کہ یہ

قادیانیوں کے خلاف کچھ لکھیں تاکہ امت کا ایمان محفوظ ہو۔ آپ کی اس کوشش کا یہ صلہ ہے کہ علامہ محمد اقبال نے تاریخ ساز معرکہ آرا خط وکتابت پنڈت نہرو سے کی کہ جس سے قادیانیت کے خط وخال واضح ہو گئے''۔ (قادیانیت کے خلاف قلمی جہاد کی سرگزشت:ص ۱۴۰)

یہ میرے خیال میں علامہ انور شاہ کشمیریؒ اور علامہ اقبالؒ کی شاید سب سے پہلی ملاقات تھی۔ اسی ملاقات نے علامہ اقبالؒ کو حضرت شاہؒ کا گرویدہ بنا دیا۔ علامہ انور شاہ ڈاکٹر صاحب کو کام پر لگا کر واپس دیو بند چلے گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس فریضہ کو زندگی کے آخری سانسوں تک ادا کیا۔ امام العصر علامہ انور شاہ کشمیریؒ اس فتنہ کے بارے میں اس قدر پریشان تھے کہ مولانا محمد یوسف بنوریؒ فرماتے تھے کہ حضرت شاہ صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ چھ ماہ تک مجھے اس پریشانی کی وجہ سے نیند نہیں آئی۔ دعائیں اور استخارے کرتا رہا۔ آخر چھ ماہ کے بعد تسلی دی گئی۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے اس فتنہ کے استیصال اور خاتمے کے لیے سیاسی اور علمی ہر سطح پر کام شروع کیا۔ ایک طرف تو راسخ العلم علماء کی ایک جماعت تیار کی جو اس فتنہ کا علمی محاسبہ کریں اور میدان مناظرہ میں ان کا مقابلہ کریں، ان میں سرفہرست حضرت مولانا مرتضیٰ حسن چاند پوریؒ، محدث شہیر مولانا سید بدر عالم میرٹھیؒ، شیخ الحدیث مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ اور مفتی اعظم پاکستان مولانا مفتی محمد شفیعؒ جیسے جید علماء تھے جنھوں نے ملک بھر میں ان سے مناظرے کر کے ان کا ناطقہ بند کر دیا۔ دوسری طرف آپ نے مجلس احرار اسلام کی سرپرستی کی اور اس کے روح رواں حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ جیسے آتش بیان اور شعلہ نوا مقرر کی سرپرستی میں مقررین کی ایک ٹیم کو متوجہ کیا جس میں خطیب اسلام قاضی احسان احمد شجاع آبادیؒ، مولانا محمد علی جالندھریؒ، مولانا گل شیر خانؒ، آغا شورش کاشمیریؒ، جیسے شعلہ بیان مقررین شامل تھے۔

مقدمہ بہاول پور میں حضرت علامہ انور شاہ صاحبؒ نے عدالت میں ایک معرکۃ الآراء بیان دیا جس میں مرزا غلام احمد قادیانی کے کافر ہونے کی وجوہ بیان فرمائیں۔ پانچ روز تک قریباً پانچ پانچ گھنٹے حضرت شاہ صاحبؒ نے عدالت میں کرسی پر بیٹھ کر بیان دیا حالانکہ آپ ان دنوں

سخت بیمار تھے اور اس کے چند روز بعد آپ کا انتقال ہو گیا۔ مقدمہ کی سماعت کے بعد جب حضرت شاہ صاحبؒ واپس دیو بند جانے لگے تو مفتی محمد صادقؒ اور دیگر علماء سے فرمایا: ''مقدمہ کا فیصلہ اگر تو میری زندگی میں ہو گیا تو میں سن لوں گا۔ اور اگر یہ فیصلہ میری وفات کے بعد ہوا تو میری قبر پر آ کر سنا دینا''۔ چنانچہ حضرتؒ کی واپسی کے بعد آپ کی جلد وفات ہو گئی اور یہ فیصلہ آپ کی وفات کے بعد ہوا اور حضرت مولانا محمد صادق صاحبؒ حضرت شاہ صاحبؒ کی وصیت کے مطابق خصوصی طور پر دیو بند گئے اور آپ کی قبر پر کھڑے ہو کر یہ فیصلہ سنایا۔ الحمدللہ فیصلہ مسلمانوں کے حق میں ہوا تھا اور سیشن جج بہاولپور محمد اکبر صاحب نے ہندوستان کی تاریخ میں پہلی بار عدالتی فیصلہ میں قادیانیوں کو کافر قرار دیا جس کی وہ عدالت عالیہ میں اس لیے اپیل نہ کرا سکے کہ فیصلہ اتنا مدلل تھا کہ اگر قادیانی اپیل کرتے اور عدالت عالیہ ان کے خلاف فیصلہ کر دیتی تو وہ ایک مستقل قانون بن جاتا، اس واقعہ سے اندازہ فرمائیں کہ حضرت شاہ صاحبؒ کو اس قادیانی مسئلہ کے بارے میں کس قدر فکر اور کتنا لگاؤ تھا کہ وفات کے بعد بھی جب کہ وہ عالم برزخ میں تشریف لے گئے تھے، وہاں بھی آپ کو اس فیصلہ کا انتظار تھا۔

ایک مرتبہ علامہ شمس الحق افغانی شیخ التفسیر اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور نے جو علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے اجل شاگردوں میں سے تھے، فرمایا کہ جب حضرت شاہ صاحبؒ کا آخری وقت آیا۔ کمزوری بہت زیادہ تھی۔ چلنے کی طاقت بالکل نہ تھی۔ اس وقت حضرتؒ نے فرمایا: ''مجھے دارالعلوم کی مسجد میں پہنچائیں۔'' حضرتؒ کے لیے ایک پالکی لائی گئی اور اس میں آپ کو بٹھا کر دارالعلوم کی مسجد میں پہنچایا گیا۔ محراب میں تکیے وغیرہ لگا کر آپ کو بٹھایا گیا۔ حضرتؒ کی آواز اس وقت انتہائی نحیف تھی۔ تمام بڑے بڑے شاگرد ارد گرد ہمہ تن گوش بنے بیٹھے تھے۔ آپ نے اس وقت صرف دو باتیں فرمائیں:

(1) پہلی بات یہ کہ میں نے تاریخ اسلام کا جس قدر مطالعہ کیا ہے، اسلام میں چودہ سو سال کے اندر جس قدر فتنے پیدا ہوئے، قادیانی فتنہ ان میں سب سے زیادہ خطرناک اور سنگین ہے۔

(2) دوسری بات یہ فرمائی کہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کو جس قدر خوشی اور مسرت اس شخص سے ہوگی جو اس کے استیصال کے لیے کوشش کرے گا، اس کے اس عمل سے زیادہ خوش ہوں گے۔

اور پھر آخر میں فرمایا: ''جو کوئی اس فتنہ کی سرکوبی کے لیے اپنے آپ کو لگا دے گا اس کی جنت کا میں ضامن ہوں''۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ کے نزدیک اس قادیانی مسئلہ کی کیا اہمیت تھی۔ اسی اہمیت کے تحت آپ بیماری اور ضعف کے باوجود دیوبند سے لاہور تشریف لائے اور ڈاکٹر جلال الدین مرحوم کے ہاں قیام فرمایا اور علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ سے تین گھنٹے ملاقات کر کے اس مسئلہ کی اہمیت کو واضح کیا اور ان سے جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں کام کرنے کے لیے فرمایا جس کی ڈاکٹر صاحب نے ہامی بھرلی اور پھر اس بارے میں وہ کام کیا کہ قادیانی تو ایک طرف پنڈت جواہر لعل نہرو بھی چلا اٹھا اور اس نے ڈاکٹر صاحب کے مضامین کے جواب میں مضامین لکھنے شروع کیے، لیکن ڈاکٹر صاحبؒ نے اس کے مضامین کا جواب بھی دیا اور پنڈت جی کو خاموش ہونا پڑا۔

علامہ محمد اقبالؒ قادیانیت کے تعاقب میں:

مرزا قادیانی اور قادیانیوں نے برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کی اجتماعی حیات پر جس طرح کلہاڑا چلایا اور سلطنت برطانیہ کی جس ضرورت یعنی تنسیخ جہاد اور اطاعت برطانیہ کو پورا کیا، اس کی تفصیل گذشتہ سطور میں اجمالی طور پر دی گئی۔ مسلمان ختم نبوت کے اس مسئلہ پر بھلا کیسے خاموش رہ سکتے تھے۔ چنانچہ اس بارے میں علامہ انور شاہ کشمیریؒ، شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ سے لے کر پروفیسر الیاس برنی اور سید ابوالحسن علی ندویؒ وغیرہ اکابر امت نے بڑی قابل قدر خدمات انجام دیں، مگر قادیانیت کو نقد و نظر کے جس ترازو میں حکیم الامت علامہ اقبالؒ نے تولا یہ صرف انہی کا حق تھا۔ آپ نے مسئلہ خاتمیت کو جدید رنگ میں پیش کیا اور قادیانیت کے فریب اور دجل کو نہ صرف ہندوستان میں بے نقاب کیا بلکہ یورپ میں بھی اس کے خلاف سب سے پہلے حضرت علامہ ہی نے آواز اٹھائی اور مسلمانوں سے الگ اقلیت قرار دینے کا مطالبہ بھی سب سے پہلے انہوں نے ہی کیا۔ اس بارے میں مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ نے لکھا ہے

''شاعر مشرق علامہ ڈاکٹر محمد اقبال مرحوم اپنے بلند پایہ علمی افکار کی بنا پر ہمارے جدید حلقوں کا مرجع عقیدت ہیں۔ ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر لوگوں نے جس فراخ قلبی سے تحقیق وتفتیش کا معرکہ سر کیا ہے، وہ ہمارے ماضی قریب کے کسی لیڈر کے حصہ میں نہیں آیا، لیکن علامہ مرحوم کی زندگی کا ایک نمایاں پہلو جوان کے آخری دور حیات میں گویا ان کی زندگی کا واحد مشن بن گیا تھا مصلحت پسندوں نے اسے اجاگر کرنے سے پہلوتہی کی۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہوگی کہ دیوبند کے ایک مرد قلندر (علامہ انور شاہ کشمیریؒ) کے فیضان صحبت نے فطرت اقبال کے اس پہلو کی مشاطگی کی تھی۔ مولانا کشمیریؒ کے سوز جگر نے اقبال مرحوم کو قادیانیت کے خلاف شعلۂ جوالہ بنا دیا تھا۔ چنانچہ علامہ مرحوم جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں پہلے شخص تھے جن کو فتنہ قادیانیت کی سنگینی نے بے چین کر رکھا تھا۔ وہ اس فتنہ کو اسلام کے لیے مہلک اور وحدت ملت کے لیے ایک مہیب خطرہ تصور کرتے تھے۔ ان کی تقریر وتحریر میں ''قادیانی ٹولے'' کو ''غدارانِ اسلام'' اور ''باغیان محمد صلی اللہ علیہ وسلم'' سے یاد کیا جاتا تھا، اس لیے کہ ان کے نزدیک اس فرقہ کے موقف کی ٹھیک ٹھیک تعبیر کے لیے اس سے زیادہ موزوں کوئی لفظ نہیں تھا، نہ ہو سکتا تھا۔ وہ اس فتنہ کے استیصال کو سب سے بڑا ملی فرض سمجھتے تھے، اور وہ ایک شفیق اور صاحب بصیرت سرجن کی طرح مضطرب تھے کہ اس ''ناپاک ناسور'' کو جسد ملت سے کاٹ پھینکا جائے ورنہ یہ ساری امت کو لے ڈوبے گا۔ افسوس کہ اقبال کے جانشینوں نے اقبال کی ''بانگ درا'' پر گوش برآواز ہونے کی ضرورت نہ سمجھی، ورنہ اگر نقاش پاکستان کے انتباہ پر توجہ کی جاتی تو اقبال کے پاکستان کی تاریخ ''شہید ملت لیاقت علی خان کے قتل سے شروع ہو کر مشرقی پاکستان کے قتل تک رونما ہونے والے واقعات سے یقیناً پاک ہوتی۔ 7 ستمبر 1947ء فیصلہ پیغام اقبال کا جواب نہیں، بلکہ اس کی بسم اللہ ہے۔ اقبال کا پیغام یہ ہے کہ مسلمانوں کے مذہبی، سیاسی اور معاشرتی اداروں میں اس باغی گروہ کی شرکت امت مسلمہ کی موت ہے۔ آج صرف پاکستانی نہیں بلکہ پورا عالم اسلام ان باغیانِ اسلام کی سازشوں کی آماجگاہ بنا ہوا ہے''

(پیام اقبال، محمد یوسف لدھیانوی، لولاک یکم مارچ ۱۹۷۶ء)

قادیانیوں کی اسی ریشہ دوانیوں اور اسلام اور وطن سے غداری کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب نے کہا تھا:

I have no doubt in my mind that the Ahmadis are traitors bot to Islam and to India. (Thoughts and Reflection of Iabal. P.306by Syed Abdul Wahid)

یعنی اس بارے میں میرے ذہن میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ احمدی اسلام اور ہندوستان دونوں کے غدار ہیں۔

یہ الفاظ اس شخص کے ہیں جو ''فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں'' اور ختم نبوت کو حفظ ملت کا سر بتانے والا تھا۔ اس نے قادیانیت کا بنظر غائر مطالعہ کر کے تجزیہ کے طور پر یہ الفاظ بے ساختہ کہے تھے.

قادیانیوں کی امت مسلمہ سے علیحدگی کا مطالبہ:

بدن میں جب ناسور اور کینسر پیدا ہو جائے تو اس کا واحد علاج یہ ہے کہ اس حصہ کو کاٹ کر پھینک دیا جائے۔ جب حضرت علامہ کے مطالعہ اور تجزیہ نے یہ بتایا کہ قادیانی اسلام اور وطن دونوں کے لیے کینسر (غدار) کی حیثیت رکھتے ہیں تو انہوں نے ڈنکے کی چوٹ پر اور بغیر لگی لپٹی یہ مطالبہ کر دیا، اور قادیانیوں کے بارے میں مسلمانوں کی طرف سے یہ سب سے پہلے شخص ہیں جنہوں نے یہ مطالبہ کیا تھا:

''حکومت قادیانیوں کو ایک الگ جماعت تسلیم کرے۔ یہ قادیانیوں کی پالیسی کے عین مطابق ہوگا، اور مسلمان اس سے ویسی رواداری سے کام لے گا جیسی وہ باقی مذاہب کے معاملہ میں اختیار کرتا ہے'' (حرف اقبال، ص۱۱۹، لطیف احمد شیروانی۔ ایم۔اے)

نیز فرمایا:

''ملت اسلامیہ کو اس مطالبہ کا پورا حق حاصل ہے کہ قادیانیوں کو علیحدہ کر دیا جائے۔ اگر حکومت نے یہ مطالبہ تسلیم نہ کیا تو مسلمانوں کو شک گزرے گا کہ حکومت اس نئے مذہب

کی علیحدگی میں دیر کررہی ہے‘‘ (حرف اقبال، ص ۱۲۹)

صحبت پیر روم سے مجھ پہ ہوا یہ راز فاش
سو حکیم سر بجیب ایک کلیم سر بکف

اب علامہ اقبال کلیم سر بکف ہوگئے اور آپ نے ایک طرف تو مسئلہ ختم نبوت پر مختلف قسم کے مضامین اور اس کی وضاحت پر مضامین لکھنے اور لیکچر دینے شروع کردیئے۔ اس کے ساتھ ہی آپ نے مختلف اداروں کو قادیانیوں سے پاک کرنا شروع کردیا۔ چنانچہ وہ انجمن حمایت اسلام کے صدر تھے۔ آپ نے انجمن کے تمام قادیانی ارکان کو انجمن کے بھرے اجلاس سے نکلوادیا۔ جب وہ ارکان نکل گئے تب حضرت علامہ کرسی صدارت پر تشریف فرما ہوے۔ (چٹان: ص ۴ مورخہ ۲۴ جولائی ۱۹۶۷ء)

اور احرار کے اصرار پر مسلم لیگ کے پارلیمانی بورڈ نے اپنے حلف نامے میں یہ شق رکھی ’’میں اقرار صالح کرتا ہوں کہ اگر میں آئندہ پنجاب اسمبلی میں نامزد ہوکر کامیاب ہوگیا تو اسلام اور ہندوستان کے مفاد کی خاطر مرزائیوں کو دوسرے مسلمانوں سے علیحدہ اقلیت قرار دیئے جانے کے لیے انتہائی کوشش کروں گا‘‘ (اقبال کے آخری دو سال: ص ۲۴۱، اشق حسین بٹالوی)

حضرت علامہ محمد اقبالؒ نے صدر پنجاب مسلم لیگ کی حیثیت سے اس کی توثیق فرما کر سیاسی سطح پر قادیانیت کو سیاسی سطح پر ایک ورضرب کاری لگائی۔

قادیانی مسلمان کہلانے پر کیوں اصرار کرتے ہیں؟

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک طرف تو قادیانیوں نے اپنا الگ نبی بنالیا، جو اپنے آپ کو عین محمد صلی اللہ علیہ وسلم سمجھتا ہے۔ چنانچہ اپنی کتاب خطبہ الہامیہ میں لکھا ہے کہ

جس نے مجھ میں اور مصطفےٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) میں فرق کیا اس نے مجھے نہیں پہچانا‘‘

مرزا محمود احمد قادیانی نے ایک مرتبہ ’’مسیح موعود محمد است وعین محمد است‘‘ کے عنوان سے ایک مضمون اخبار الفضل میں لکھا:

☆ معروف ادیب، دانشور و سیرت ایوارڈ یافتہ

''ادھر بچہ پیدا ہوتا ہے اور اس کے کان میں اذان دی جاتی ہے، اور شروع ہی میں اس کو خدا اور خدا کے رسول پاک کا نام سنایا جاتا ہے، بعینہ یہ بات میرے ساتھ ہوئی۔ میں ابھی احمدیت میں بطور بچہ ہی تھا جو میرے کانوں میں یہ آواز پڑی کہ ''مسیح موعود محمد است وعین محمد است۔'' میں اس سے بالکل بے بہرہ تھا کہ مسیح موعود پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ ''منم محمد واحمد کہ مجتبیٰ باشد''(مضمون الفضل قادیان ۱۷ اگست ۱۹۱۵ء)

مرزا غلام احمد قادیانی نے اپنے نہ ماننے والوں کو کافر کہا (حقیقۃ الوحی: ص ۱۹۷) اپنے مریدوں کو مسلمانوں کے پیچھے نماز پڑھنے سے منع کیا۔ (سیرۃ المہدی، جلد ۳ ص ۳۱)

جب خود یہ اپنے آپ کو مسلمانوں سے الگ تصور کرتے ہیں تو پھر قانونی اور سیاسی طور پر مسلمانوں کا جزو بنے رہنے پر کیوں اصرار کرتے ہیں؟ حضرت علامہ کے خیال میں ایسا وہ صرف اس لیے کرتے ہیں

''............ان کا شمار حلقہ اسلام میں ہو تا کہ انہیں سیاسی فوائد پہنچ سکیں''.(حرف اقبال ص ۱۲۸)

اسی وجہ سے حضرت علامہ نے فرمایا کہ

''قادیانی حکومت سے کبھی علیحدگی کا مطالبہ کرنے میں پہل نہیں کریں گے''.(حرف اقبال ص ۴۹)

وہ سیاسی فوائد کیا ہے؟ اس بارے میں حضرت علامہ فرماتے ہیں:

''اس امر کو سمجھنے کے لیے کسی خاص ذہانت یا غور وفکر کی ضرورت نہیں کہ جب قادیانی مذہبی اور معاشرتی معاملات میں علیحدگی کی پالیسی اختیار کرتے ہیں۔ پھر وہ سیاسی طور پر مسلمانوں میں رہنے کے لیے کیوں مضطرب ہیں؟ علاوہ سرکاری ملازمتوں کے فوائد کے ان کی موجودہ آبادی جو چھپن ہزار ہے انہیں کسی اسمبلی میں ایک نشست بھی نہیں دلاسکتی اور اس لیے انہیں سیاسی اقلیت کی حیثیت بھی نہیں مل سکتی۔ یہ واقعہ اس امر کا ثبوت ہے کہ قادیانیوں نے اپنی جداگانہ سیاسی حیثیت کا مطالبہ نہیں کیا کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ مجالس قانون ساز میں ان کی نمائندگی نہیں ہوسکتی''.(حرف اقبال: ص ۱۲۸، لطیف احمد شیروانی)

حضرت علامہ نے قادیانیت کا نہایت گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا۔اس وجہ سے ان پر مرزا غلام احمد نے مخفی عزائم و دعاوی بے نقاب ہوے اور وہ قادیانی تحریک کو وحدت ملی کے خلاف ایک سازش سمجھتے ہوے اس کی زبردست مزاحمت کرنے لگے چنانچہ وہ قادیانیت کو''برگ حشیش''، ''غارت گر اقوام''، ''فتنہ ملت بیضاء''، ''قوت فرعون کی درپردہ مرید''، ''یہودیت کا ثنیٰ''، ''انتشار کا منبع''، ''فرنگی انقلاب کے حق میں الہامی سند''، مرزا غلام احمد کو چنگیز خان اور قادیانیوں کو اسلام اور ملک کا غدار قرار دے کر مسلمانوں سے الگ کر دینے کا پرزور مطالبہ کرنے لگے اور یورپ تک اس فتنہ کا تعاقب کیا۔مولانا عبدالمجید سالک نے بھی لکھا ہے

''رد قادیانیت میں حضرت علامہ نے بعض ایسے نکات پیش کیے جن کا جواب اب تک کسی سے نہیں ہو سکا'' (ذکر اقبال: ص۲۱۱، عبدالمجید سالک)

اس بات کا اقرار کہ علامہ زندگی کے آخری ایام میں قادیانیت کے سخت مخالف تھے، خود قادیانیوں کو بھی ہے، چنانچہ مرزا غلام احمد کے لڑکے اور ایم۔ایم احمد کے باپ مرزا بشیر احمد ایم۔اے نے لکھا ہے کہ:

''ڈاکٹر سر محمد اقبال اپنی زندگی کے آخری ایام میں (احمدیت کے) شدید طور پر مخالف رہے اور ملک کے نو تعلیم یافتہ طبقہ میں احمدیت کے خلاف جو زہر پھیلا ہوا ہے اس کی بڑی وجہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کا مخالفانہ پراپیگنڈہ تھا''. (سیرت المہدی: جلد۳ ص۲۴۹، مرزا بشیر احمد ایم۔اے)

کشمیر کمیٹی سے مرزا محمود کا انخلاء:

1933ء میں کشمیر کے مظلوم مسلمانوں کی امداد کے لیے ایک کمیٹی بنائی گئی کیونکہ سالہا سال سے کشمیر کے مظلومین ڈوگرا حکومت کے جبر و تشدد اور ظلم و ستم کا شکار چلے آرہے تھے۔حضرت علامہ کو چونکہ اس ارض چنار سے ایک دلی لگاؤ تھا کیونکہ یہ ان کے آباء واجداد کا وطن تھا۔اس لیے انہوں نے کشمیر کمیٹی میں شمولیت اختیار کر لی۔اس کمیٹی کے صدر مرزا محمود اور سیکرٹری عبدالرحیم تھے۔ اس کمیٹی کا کوئی دستور نہ تھا اس لیے صدر کو لامحدود اختیارات دے دیئے گئے۔حضرت علامہ بشیر

الدین محمود کے سیاسی عزائم کو نہ بھانپ سکے، لیکن جلد ہی انہیں پتہ چل گیا، کہ صدر اور سیکرٹری دونوں وائسرائے اور دیگر اعلیٰ برطانوی حکام کو خفیہ اطلاعات پہنچانے کا نیک کام کرتے ہیں (پنجاب کی سیاسی تحریکیں، ص ۲۱۰، عبداللہ ملک) اور مرزا محمود نے اپنے لامحدود اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے کشمیر کمیٹی کو قادیانیوں کی ذیلی شاخ بنا کر رکھ دیا ہے اور عام مسلمانوں کے چندے سے سارے کشمیر میں قادیانی مبلغ پھیلا دیئے ہیں۔ حضرت علامہ کو جب ان باتوں کا پتہ چلا تو انہوں نے انتہائی سختی سے اس کا نوٹس لیا اور مرزا محمود کو کمیٹی کی صدارت چھوڑ دینے پر مجبور کر دیا اور خود بھی استعفیٰ دے کر کمیٹی توڑ ڈالی۔ اس موقع پر حضرت علامہ نے جو بیان دیا وہ نہایت اہم ہے۔ فرمایا:

”بدقسمتی سے کمیٹی میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنے مذہبی فرقے کے امیر کے سوا کسی دوسرے کا اتباع کرنا سرے سے گناہ سمجھتے ہیں۔ چنانچہ احمدی وکلاء میں سے ایک صاحب نے جو میر پور کے مقدمات کی پیروی کر رہے تھے، حال ہی میں اپنے ایک بیان میں واضح طور پر اس خیال کا اظہار کر دیا۔ انہوں نے صاف طور پر کہا کہ وہ کسی کشمیر کمیٹی کو نہیں مانتے اور جو کچھ انہوں نے یا ان کے ساتھیوں نے اس ضمن میں کیا وہ ان کے امیر کے حکم کی تعمیل تھی۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں نے ان کے اس بیان سے اندازہ لگایا کہ تمام احمدی حضرات کا یہی خیال ہوگا، اور اس طرح میرے نزدیک کشمیر کمیٹی کا مستقبل مشکوک ہو گیا۔ میں کسی صاحب پر انگشت نمائی نہیں کرنا چاہتا، ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنے دل و دماغ سے کام لے اور جو راستہ پسند ہو اسے اختیار کرے۔ حقیقت میں مجھے ایسے شخص سے ہمدردی ہے جو کسی روحانی سہارے کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے کسی مقبرہ کا مجاور یا کسی زندہ نام نہاد پیر کا مرید بن جائے...... ان حالات کے پیش نظر مجھے اس امر کا یقین ہے کہ کمیٹی سے اب ہم آہنگی کے ساتھ کام نہیں ہو سکتا اور ہم سب کا مفاد اسی میں ہے کہ موجودہ کشمیر کمیٹی کو ختم کر دیا جائے“۔

(حرف اقبال، ص ۲۰۲، لطیف احمد شیروانی)

حقیقت یہ ہے کہ یہیں سے حضرت علامہ کی قادیانیت کے خلاف کھلی لڑائی کا آغاز ہوا

چنانچہ لکھا ہے کہ

''علامہ اقبال نے کشمیر کمیٹی کے دوران قادیانیوں کی سرگرمیوں کا گہری نظر سے جائزہ لیا تھا اور کشمیر کمیٹی کے یہ واقعات اس لحاظ سے بھی اہم ہیں کہ اپنی واقعات کے بعد ڈاکٹر صاحب نے قادیانی تحریک کی سختی سے مخالفت کرنی شروی کردی''۔ (احرار اور تحریک کشمیر:ص ۱۶۱، بحوالہ اقبال کا سیاسی کارنامہ)

یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ حضرت علامہ کی لڑائی اصولی تھی ذاتی نہ تھی، اور ویسے بھی علامہ گھٹیا سیاسی مفاد کی خاطر مذہب کو آڑ بنانے کے قائل نہ تھے۔ انہوں نے محض ملک وملت کے بہترین مفاد کو سامنے رکھ کر قادیانیت کی مخالفت کی اور ایسا کرنا ان کے لیے ناگزیر تھا۔

قادیانی اور جمہور مسلمان:

حضرت علامہ نے آل انڈیا کشمیر کمیٹی سے استعفٰی دینے کے بعد مئی 1953ء میں قادیانیوں کے بارے میں ایک بیان دیا۔ اس بیان نے ایوان قادیانیت کے در و بام کو ہلا کر رکھ دیا۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ اس زمانہ کے قریباً تمام انگریزی اور اردو اخبارات نے اس کو شائع کیا اور اکثر و بیشتر نے اس پر آرٹیکل لکھے۔ (مکتوبات اقبال ص ۲۱۳ مرتبہ سید نذیر نیازی)

خود حضرت علامہ اپنے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں کہ

''(یہ بیان) قریباً تمام انگریزی اخباروں میں شائع ہوا۔ ایسٹرن ٹائمز (لاہور) سٹیٹمین (دہلی)، سٹار آف انڈیا (کلکتہ) علاوہ اس کے اردو اخباروں میں اس کا ترجمہ بھی شائع ہوا ہے۔'' (مکتوبات اقبال: ص ۲۷۲، سید نذیر نیازی)

وہ بیان جو حضرت علامہ نے دیا حسب ذیل ہے:

''قادیانیوں اور جمہور مسلمانوں کی نزاع نے نہایت اہم سوال پیدا کیا ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں نے حال ہی میں اس کی اہمیت کو محسوس کرنا شروع کیا۔ میرا ارادہ تھا کہ انگریز قوم کو ایک کھلی چھٹی کے ذریعہ اس مسئلہ کے معاشرتی اور سیاسی پہلوؤں سے آگاہ کروں، لیکن افسوس کہ صحت نے ساتھ نہ دیا، البتہ ایک ایسے معاملہ کے متعلق جو تمام

ہندی مسلمانوں کی پوری قومی زندگی سے وابستہ ہے، میں نہایت مسرت سے کچھ عرض کروں گا، لیکن میں آغاز ہی میں قادیانی تحریک کے بانی کا نفسیاتی تجزیہ کرنا چاہتا ہوں۔ پہلی چیز عام مسلمانوں کے لیے کچھ دل چسپی نہیں رکھتی اور دوسری کے لیے ہندوستان میں ابھی وقت نہیں آیا۔

ہندوستان کی سرزمین میں بے شمار مذاہب بستے ہیں۔ اسلام دینی حیثیت سے ان تمام مذاہب کی نسبت زیادہ گہرا ہے، کیونکہ ان مذاہب کی بنیاد کچھ حد تک مذہبی ہے، اور ایک حد تک نسلی۔ اسلام نسلی تخیل کی سراسر نفی کرتا ہے اور اپنی بنیاد محض مذہبی تخیل پر رکھتا ہے۔ اور چونکہ اس کی بنیاد صرف دینی ہے اس لیے وہ سراپا روحانیت ہے اور خونی رشتوں سے کہیں زیادہ لطیف بھی ہے۔ اسی لیے مسلمان ان تحریکوں کے معاملہ میں زیادہ حساس ہے جو اس کی وحدت کے لیے خطرناک ہیں۔ چنانچہ ہر ایسی مذہبی جماعت جو تاریخی طور پر اسلام سے وابستہ ہو لیکن اپنی بنیاد نئی نبوت پر رکھے اور بزعم خود اپنے الہامات پر اعتقاد نہ رکھنے والے تمام مسلمانوں کو کافر سمجھے، مسلمان اسے اسلام کی وحدت کے لیے خطرہ تصور کرے گا اور یہ اس لیے کہ اسلامی وحدت ختم نبوت سے ہی استوار ہوتی ہے۔

انسانیت کی تمدنی تاریخ میں غالباً ختم نبوت کا تصور سب سے انوکھا ہے۔ اس کا صحیح اندازہ مغربی اور وسط ایشیا کے موبدانہ تمدن کی تاریخ کے مطالعہ سے ہوسکتا ہے۔ موبدانہ تمدن میں زرتشتی، یہودی، نصرانی اور صابی تمام مذاہب شامل ہیں۔ ان تمام مذاہب میں نبوت کے اجزاء کا تخیل نہایت لازم تھا، چنانچہ ان پر مستقل انتظار کی کیفیات رہتی تھی۔ غالباً یہ حالت انتظار نفسیاتی خط کے باعث تھی۔

عہد جدید کا انسان روحانی طور پر موبد سے بہت زیادہ آزاد منش ہے۔ موبدانہ رویہ کا نتیجہ یہ تھا کہ پرانی جماعتیں ختم ہوتیں اور ان کی جگہ مذہبی عیار نئی جماعتیں لا کھڑی کرتے۔ اسلام کی جدید دنیا میں جاہل اور جوشیلے ملاّ نے پریس کا فائدہ اٹھاتے

ہوئے انتہائی ڈھٹائی سے بیسویں صدی میں قبل از اسلام کے موبدانہ نظریات کو رائج کرنا چاہا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ اسلام جو تمام قومیتوں کو ایک ہی رسی میں پرونے کا دعویٰ رکھتا ہے، ایسی تحریک کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں رکھ سکتا جو اس کی موجودہ وحدت کے لیے خطرہ ہو اور مستقبل میں انسانی معاشرہ میں مزید تشتت و انتشار کا باعث بنے۔

قبل از اسلام کی موبدیت نے حال ہی میں جن دو صورتوں میں جنم لیا ہے، ان میں میرے نزدیک ایک قادیانیت سے کہیں زیادہ مخلص ہے، کیونکہ وہ کھلے طور پر اسلام سے باغی ہے، لیکن مؤخر الذکر اسلام کی چند نہایت اہم صورتوں کو ظاہری طور پر قائم رکھتی ہے، مگر باطنی طور پر اسلام کی روح اور مقاصد کے لیے انتہائی مہلک ہے۔ اس کے حاسد کا تصور، جس کے پاس مخالفین کے لیے لاتعداد زلزلے اور بیماریاں ہیں، اور نبی سے متعلق نجومی کا تخیل اور روح مسیح کے لیے تسلسل کا عقیدہ وغیرہ۔ یہ سب چیزیں اپنے اندر یہودیت کے اتنے عناصر رکھتی ہیں گویا کہ یہ تحریک ہی یہودیت کی طرف رجوع ہے۔ روح مسیح کا تسلسل یہودی باطنیت کا جزو ہے۔ پولی مسیح بال شیم (Baal Shem) کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر بوبر (Buber) کہتا ہے کہ مسیح کی روح پیغمبروں اور صالح آدمیوں کے واسطے سے زمین پر اتری۔ اسلامی ایران میں موبدانہ اثر کے تحت ملحدانہ تحریکیں اٹھیں اور انہوں نے بروز، حلول اور ظل وغیرہ اصطلاحات وضع کیں تاکہ تناسخ کے اس تصور کو چھپا سکیں۔ ان اصطلاحات کا وضع کرنا اس لیے لازم تھا کہ وہ مسلم قلوب کو ناگوار نہ گزریں حتیٰ کہ مسیح موعود کی اصطلاح بھی اسلامی نہیں بلکہ اجنبی ہے اور اس کا آغاز بھی اسی موبدانہ تصور میں ملتا ہے۔ یہ اصطلاح ہمیں اسلام کے دورِ اول کی تاریخ اور مذہبی ادب میں نہیں ملتی۔ اس حیرت انگیز واقعہ کو پروفیسر ونسنک (Winsinck) نے اپنی کتاب موسومہ ''احادیث میں ربط'' میں نمایاں کیا ہے۔ یہ کتاب احادیث کے گیارہ مجموعوں اور اسلام کے تین اولین تاریخی شواہد پر حاوی ہے۔ اور یہ سمجھنا کچھ مشکل نہیں کہ

اسلاف نے اس اصطلاح کو کیوں استعمال نہیں کیا؟ یہ اصطلاح انہیں غالباً اس لیے ناگوار تھی کہ اس سے تاریخی عمل کا غلط نظریہ قائم ہوتا تھا۔ خاکی ذہن وقت کو مدور حرکت تصور کرتا تھا۔ صحیح تاریخی عمل کو بحیثیت ایک تخلیقی حرکت کے ظاہر کرنے کی سعادت عظیم مسلمان مفکر اور مؤرخ یعنی ابن خلدون کے حصہ میں تھی۔

ہندی مسلمانوں نے قادیانی تحریک کے خلاف جس شدت احساس کا ثبوت دیا ہے وہ جدید اجتماعیات کے طالب علم پر واضح ہے۔ عام مسلمان جسے پچھلے ہی دنوں ''سول اینڈ ملٹری گزٹ'' میں ایک صاحب نے ''ملّا زدہ'' کا خطاب دیا تھا، اس تحریک کے مقابلہ میں حفظ نفس کا ثبوت دے رہا ہے۔ اگرچہ اسے ختم نبوت کے عقیدہ کی پوری سمجھ نہیں نام نہاد تعلیم یافتہ مسلمانوں نے ختم نبوت کے تمدنی پہلو پر کبھی غور نہیں کیا اور مغربیت کی ہوا نے انہیں حفظ نفس کے جذبہ سے بھی عاری کر دیا ہے۔ بعض ایسے ہی نام نہاد تعلیم یافتہ مسلمانوں نے اپنے مسلمان بھائیوں کو رواداری کا مشورہ دیا ہے۔ اگر سرہربرٹ ایمرسن (اس وقت کے گورنر) مسلمانوں کو رواداری کا مشورہ دیں تو میں انہیں معذور سمجھتا ہوں کیونکہ موجودہ زمانے کے فرنگی کے لیے جس نے مختلف تمدن میں پرورش پائی ہو، اس کے لیے اتنی گہری نظر پیدا کرنی دشوار ہے کہ وہ ایک مختلف تمدن رکھنے والی جماعت کے اہم مسائل کو سمجھ سکے۔

ہندوستان میں حالات بہت غیر معمولی ہیں۔ اس ملک کی بے شمار مذہبی جماعتوں کی بقا اپنے استحکام کے ساتھ وابستہ ہے کیونکہ جو مغربی قوم یہاں حکمران ہے، اس کے لیے اس کے سوا چارہ نہیں کہ مذہب کے معاملہ میں عدم مداخلت سے کام لے۔ اس پالیسی نے ہندوستان جیسے ملک پر بدقسمتی سے بہت برا اثر ڈالا ہے۔ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے یہ مبالغہ نہ ہوگا کہ مسلم جماعت کا استحکام اس سے کہیں کم ہے جتنا حضرت مسیح (علیہ السلام) کے زمانہ میں یہودیت جماعت کا رومن کے ماتحت تھا۔ ہندوستان میں کوئی مذہبی سٹے

باز اپنی اغراض کی خاطر ایک نئی جماعت کھڑی کر سکتا ہے اور یہ لبرل حکومت اصل جماعت کی وحدت کی ذرہ بھر پروا نہیں کرتی بشرطیکہ یہ مدعی اسے اپنی اطاعت اور وفاداری کا یقین دلا دے، اور اس کے پیرو حکومت کے محصول ادا کرتے رہیں۔ اسلام کے حق میں اس پالیسی کا مطلب ہمارے عظیم شاعر اکبر نے اچھی طرح بھانپ لیا تھا جب اس نے اپنے مزاحیہ انداز میں کہا ۔

گورنمنٹ کی خیر یارو مناؤ　　　انا الحق کہو اور پھانسی نہ پاؤ

میں قدامت پسند ہندوؤں کے اس مطالبہ کے لیے پوری ہمدردی رکھتا ہوں جو انہوں نے دستور میں مذہبی مصلحین کے خلاف پیش کیا ہے۔ یقیناً یہ مطالبہ مسلمانوں کی طرف سے پہلے پیش ہونا چاہیے تھا جو ہندوؤں کے برعکس اپنے اجتماعی نظام میں نسلی تخیّل کو دخل نہیں دیتے۔ حکومت کو موجودہ صورت حال پر غور کرنا چاہیے۔ اگر کسی قوم کی وحدت خطرے میں ہو تو اس کے لیے اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں رہتا کہ وہ معاندانہ قوتوں کے خلاف مدافعت کرے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مدافعت کا کیا طریقہ ہے؟ اور وہ طریقہ یہی ہے کہ اصل جماعت جس شخص کو تلعب بالدین کرتے پائے اس کے دعاوی کو تحریر وتقریر کے ذریعہ جھٹلایا جائے۔ پھر کیا یہ مناسب ہے کہ اصل جماعت کو رواداری کی تلقین کی جائے، حالانکہ اس کی وحدت خطرہ میں ہو اور باغی گروہ کو تبلیغ کی پوری اجازت ہو اگرچہ وہ تبلیغ دشنام سے لبریز ہو۔

اگر کوئی گروہ جو اصل جماعت کے نقطۂ نظر سے باغی ہے، حکومت کے لیے مفید ہے تو حکومت اس کی خدمات کا صلہ دینے کی پوری طرح مجاز ہے۔ دوسری جماعتوں کو اس سے کوئی شکایت پیدا نہیں ہوسکتی، لیکن یہ توقع رکھنی بیکار ہے کہ خود جماعت ایسی قوتوں کو نظر انداز کر دے جو اس کے اجتماعی وجود کے لیے خطرہ ہیں۔ اس مقام پر یہ دہرانے کی غالباً ضرورت نہیں کہ مسلمانوں کے بے شمار فرقوں کے مذہبی تنازعات کا ان بنیادی مسائل پر کچھ اثر نہیں پڑتا جن مسائل پر سب

فرقے متفق ہیں اگرچہ وہ ایک دوسرے پر الحاد کے فتوے ہی دیتے ہوں۔

ایک اور چیز بھی حکومت کی خاص توجہ کی محتاج ہے۔ ہندوستان میں مذہبی مدعیوں کی حوصلہ افزائی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ مذہب سے بالعموم بیزار ہونے لگتے ہیں اور بالآخر مذہب کے اہم عنصر کو اپنی زندگی سے علیحدہ کر دیتے ہیں۔ ہندوستانی دماغ ایسی صورت میں مذہب کی جگہ کوئی اور بدل پیدا کرے گا جس کی شکل روس کی دہری مادیت سے ملتی جلتی ہوگی، لیکن پنجابی مسلمانوں کی پریشانی کا باعث محض مذہبی سوال نہیں ہے۔ کچھ سیاسی جھگڑے بھی ہیں جن کی طرف سر ہر برٹ ایمرسن نے انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے اشارہ کیا ہے۔ یہ اگرچہ خالص سیاسی جھگڑے ہیں، لیکن ان کی اہمیت بھی مذہبی سوال سے کسی طرح کم نہیں۔ جہاں مجھے حکومت کا شکریہ ادا کرنا ہے کہ اسے پنجابی مسلمانوں کی وحدت کا احساس ہے وہاں میں حکومت کو احتساب خویش کا مشورہ بھی دوں گا۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ شہری اور دیہاتی مسلمان کی تمیز کے لیے کون ذمہ دار ہے؟ جس کی بدولت مسلمان جماعت دو گروہوں میں تقسیم ہوگئی ہے اور دیہاتی حصہ خود بہت سے گروہوں میں بٹ گیا ہے جو ہر دم آپس میں برسرِ پیکار رہتے ہیں۔

سر ہر برٹ ایمرسن پنجابی مسلمانوں کی صحیح قیادت کی عدم موجودگی کا گلہ کرتے ہیں۔ اے کاش! وہ سمجھ سکتے کہ حکومت کی اس شہری دیہاتی تمیز نے جسے وہ خود غرض سیاسی حیلہ بازوں کے ذریعہ برقرار رکھتی ہے، جماعت کو ناقابل بنا دیا ہے کہ وہ صحیح راہ نما پیدا کر سکے۔ میرے خیال میں اس حربہ کا استعمال ہی اس غرض سے کیا گیا ہے تاکہ کوئی صحیح راہ نمائی پیدا نہ ہو سکے۔ سر ہر برٹ ایمرسن صحیح راہ نمائی کی عدم موجودگی کا رونا روتے ہیں اور میں اس نظام کا رونا روتا ہوں جس نے ایسے راہ نما کی پیدائش کو ناممکن بنا دیا ہے۔'' (حرف اقبال: ص ۱۱۲۔۳۱۹، لطیف احمد شیروانی ایم۔اے)

حضرت علامہؒ کے اس بیان سے قایانی بوکھلا اٹھے اور سرکاری دائرہ میں کھلبلی مچ گئی تو آپ نے ایک مختصر توضیحی بیان دیا اور ان تمام شکوک اور غلط فہمیوں کو دور کر دیا جو اس بیان سے بعض لوگوں کے ذہنوں میں پیدا ہوئیں۔

اخبار اسٹیٹمین نے ایک تنقیدی مقالہ لکھا، علامہ مرحوم نے اس کا جواب بھی لکھا جس میں کہا کہ

''ایران میں بہائیوں نے ختم نبوت کے اصول کو صریحاً جھٹلایا، لیکن ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی تسلیم کیا کہ وہ الگ جماعت ہیں، اور مسلمانوں میں شامل نہیں ہیں۔ ہمارا ایمان ہے کہ اسلام بحیثیت دین خدا کی طرف سے ظاہر ہوا، لیکن اسلام بحیثیت سوسائٹی یا ملت کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کا مرہون منت ہے۔ میری رائے میں قادیانیوں کے سامنے صرف دو راستے ہیں۔ یا تو وہ بہائیوں کی تقلید کریں اور ختم نبوت کے اصول کو صریحاً جھٹلا دیں یا پھر ختم نبوت کی تاویلوں کو چھوڑ کر اس اصول کو اس کے پورے مفہوم کے ساتھ قبول کرلیں۔ ان کی جدید تاویلیں محض اس غرض سے ہیں کہ ان کا شمار حلقہ اسلام میں ہوتا کہ انہیں سیاسی فوائد پہنچ سکیں.

علامہؒ نے اپنے جواب میں یہ بھی فرمایا کہ

''قادیانیوں کی حکمت عملی دنیائے اسلام سے متعلق ان کے رویہ کو فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ بانی تحریک (مرزا غلام احمد قادیانی) نے ملت اسلامیہ کو سڑے ہوئے دودھ سے تشبیہ دی ہے اور اپنی جماعت کو تازہ دودھ سے، اور اپنے مقلدین کو ملت اسلامیہ سے میل جول رکھنے سے اجتناب کا حکم دیا تھا۔ علاوہ ازیں ان کا بنیادی اصولوں سے انکار، اپنی جماعت کا نام (احمدی) رکھنا، مسلمانوں کی قیام نماز سے قطع تعلق، نکاح وغیرہ کے معاملات میں مسلمانوں سے بائیکاٹ اور ان سب سے بڑھ کر یہ اعلان کہ دنیائے اسلام کافر ہے، یہ تمام امور قادیانیوں کی علیحدگی پر دال ہیں۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ اسلام سے کہیں زیادہ دور ہیں جتنے سکھ ہندوؤں سے، کیونکہ سکھ ہندوؤں سے باہمی شادیاں کرتے ہیں اگرچہ وہ ہندوؤں میں پوجا نہیں کرتے''. (حرف اقبال، ص۱۲۶ تا ۱۲۹)

ماڈرن ریویو کلکتہ میں پنڈت جواہر لعل نہرو نے قادیانیوں کی حمایت میں تین مقالوں کی

اشاعت کی اور پھر کچھ خطوط بھی حضرت علامہ کو بھیجے۔ کچھ اور لوگوں نے بھی آپ کو خطوط لکھے جس میں اس خواہش کا اظہار کیا گیا کہ حضرت علامہ قادیانیوں کے متعلق مسلمانان ہند کی روش کے بارے میں مزید توضیح کریں۔ چنانچہ آپ نے ایک طویل مضمون میں نہ صرف پنڈت جواہر لال نہرو کا جواب دیا بلکہ قادیانیوں کے بارے میں تفصیلی طور پر واضح کیا کہ ان کا مسلمانوں سے کوئی تعلق نہیں۔ اور مسئلہ ختم نبوت کو واضح کیا اور اس کے بارے میں قادیانیوں اور دوسرے لوگوں کی طرف سے جو شکوک وشبہات پیدا کیے جاتے تھے، ان کے مدلل جوابات دیئے۔ اور لکھا:

''خالص مذہبی امور سے قطع نظر سیاسی امور کی بنا پر بھی پنڈت جواہر لعل نہرو کے شایانِ شان نہیں کہ وہ مسلمانان ہند پر رجعت پسند اور قدامت پسند ہونے کا الزام لگائیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر وہ احمدیت کی اصل نوعیت کو سمجھ لیتے تو مسلمانان ہند کے اس رویہ کی ضرور تحسین وتعریف کرتے جو ایک ایسی مذہبی تحریک کے متعلق اختیار کیا گیا ہے جو ہندوستان کے تمام آفات ومصائب کے لیے الہامی سند پیش کرتی ہے۔

(تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں حرف اقبال: ص ۱۲۹ تا ۱۶۱، لطیف احمد شیروانی اے۔ اے)

پنڈت جواہر لال نہرو کے نام خط:

حضرت علامہ نے 21 جون 1936ء کو پنڈت جواہر لال نہرو کے نام ایک خط بھی لکھا جو انگریزی زبان میں تھا۔ اس خط میں بھی آپ نے قادیانیوں کی اصلیت کو واضح کیا۔ اس خط کا اردو ترجمہ حسب ذیل ہے

21 جون 1936ء

ڈیر پنڈت جواہر لال

کل آپ کا مراسلہ خط ملا جس کے لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ میں نے جب آپ کے تحریر کردہ مضامین کا جواب لکھا تو میرا گمان تھا کہ آپ کو احمدیوں کے سیاسی رویہ کا علم نہیں۔ میرے ان جوابات کے لکھنے کی بنیادی وجہ دراصل اس بات کو ظاہر کرنا اور خاص طور پر آپ پر یہ واضح کرنا تھا کہ مسلمانوں کے

اندر جذبات وفاداری کیسے پیدا ہوئے اور یہ کہ احمدیت نے ان کے لیے الہامی بنیاد کس طرح فراہم کی۔ ان مضامین کی اشاعت کے بعد میرے لیے یہ انکشاف انتہائی حیران کن تھا کہ خود مسلمانوں کا پڑھا لکھا طبقہ بھی ان تاریخی وجوہات سے ناواقف ہے جنہوں نے احمدی تعلیمات کو تشکیل کیا۔ علاوہ ازیں پنجاب اور دوسرے علاقوں میں بسنے والے آپ کے ساتھی بھی آپ کے ان مضامین کے باعث بے چینی محسوس کرتے تھے، کیونکہ ان کے خیال میں آپ کی ہمدردیاں احمدیہ تحریک کے ساتھ تھیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ آپ کے ان مضامین سے احمدی از حد خوشی محسوس کرتے تھے اور احمدی پریس خاص طور پر آپ کے خلاف اس غلط فہمی کو پھیلانے کا موجب تھا۔ بہرحال مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ میری آپ کے متعلق رائے غلط تھی۔ میں بذات خود مذہبی معاملات میں نہیں الجھتا، احمدیوں سے خود انہیں کے میدان میں مقابلہ کرنے کی خاطر مجھے اس بحث میں حصہ لینا پڑا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ان مضامین کو لکھتے وقت ہندوستان اور اسلام کی بہتری میرے پیش نظر تھی اور میں اپنے ذہن میں اس امر کے متعلق کوئی شبہ نہیں پاتا کہ احمدی اسلام اور ہندوستان دونوں کے غدار ہیں (خط کے اصل الفاظ یہ ہیں)

I have no doubt in my mind that the Ahmadis are traitors both to Islam and To India.

(Thoughts and Reflections of Iqbal, P. 306 by Syed Abdul Wahid)

پنڈت نہرو کے ان مضامین کی وجہ سے قادیانی بہت خوش ہوئے کیونکہ ان مضامین میں قادیانیوں سے ہمدردی کا اظہار کیا گیا تھا۔ چنانچہ جب پنڈت جواہر لال نہرو لاہور آئے تو قادیانیوں نے لاہور ریلوے اسٹیشن پر ان کا نہایت شاندار اور والہانہ استقبال کیا اور جواہر لال نہرو زندہ باد، محبوب قوم خوش آمدید کے نعرے لگائے۔ (الفضل قادیان: ۳۱ مئی ۱۹۳۶ء)

مسئلہ ختم نبوت کی مزید تشریحات:

خطوط اور مختلف مضامین کے علاوہ حضرت علامہ نے اپنی کتاب تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ ص ۲۷۶ میں جدید نظریات کی روشنی میں اس مسئلہ ختم نبوت کی توضیح وتشریح کی جو پڑھنے کے

قابل ہے۔ پھر مختلف خطوط میں جو مختلف لوگوں کے نام تھے ان میں بھی اس اہم مسئلہ کی وضاحت فرمائی۔ چنانچہ ایک خط میں سید نذیر نیازی کو راجہ حسن اختر کے ایک مضمون کے بارے میں جو قادیانیوں کے اعتراضات کے جواب میں راجہ صاحب نے لکھا تھا کیونکہ لاہوری جماعت کے انگریزی ہفت روزہ لائٹ (Light) نے بلاوجہ حضرت علامہ کے انگریزی خطبات بالخصوص پانچویں خطبے پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا تھا کہ علامہ کہتے ہیں کہ باب نبوت مسدود ہے۔ یہ دراصل مغرب سے مرعوبیت کا نتیجہ ہے۔ حضرت علامہ نے کہیں عقل استقرائی کا ذکر کر دیا تھا۔ مدیر لائٹ اس کا صحیح مفہوم تو نہ سمجھ سکے کیونکہ یہ بات ان کی عقل سے شاید بالا تھی، لہٰذا انہوں نے لکھ دیا کہ دیکھئے، اقبال عقل کو نبوت پر ترجیح دیتے ہیں۔ یہ مغرب زدگی نہیں تو اور کیا ہے؟ مضمون شائع ہوا تو راجہ حسن اختر صاحب نے مدیر لائٹ کے نام ایک خط لکھ کر اس کے غلط خیال کی تردید کی۔

(مکتوبات اقبال، ص ۳۰۰، مرتبہ سید نذیر نیازی)

حضرت علامہ نے اس بارے میں لکھا:

”راجہ صاحب کا مضمون میں نے نہیں دیکھا۔ دیکھا تو تھا پڑھا نہیں۔ آپ اپنے مضمون میں اپنے خیالات کا اظہار کیجیے۔ ان کے خیالات کی تردید ضروری نہیں۔“

نبوت کے دو اجزاء ہیں:

(1) خاص حالات میں واردات جن کے اعتبار سے نبوت روحانیت کا ایک خاص مقام تصور کی جاتی ہے۔ (مقام تصور اسلام میں ایک اصطلاح ہے)

(2) ایک Socis-Political Institution قائم کرنے کا عمل یا اس کا قیام۔ اس Institution کا قیام گو ایک نئی اخلاقی فضا کی تخلیق ہے جس میں پرورش پا کر فرد اپنے کمالات تک پہنچتا ہے۔ اور جو فرد اس نظام کا ممبر نہ ہو یا اس کا انکار کرے، وہ ان کمالات سے محروم ہو جاتا ہے۔ اس محرومی کو مذہبی اصطلاح میں کفر کہتے ہیں۔ گویا اس دوسری جزء کے اعتبار سے نبی کا منکر کافر ہے۔

دونوں اجزاء موجود ہوں تو نبوت ہے۔ صرف پہلا جزء موجود ہو تو تصوف اسلام میں اس کو نبوت نہیں کہتے بلکہ اس کا نام ولایت ہے۔

ختم نبوت کے معنی یہ ہیں کہ کوئی شخص بعد اسلام اگر یہ دعویٰ کرے کہ مجھ میں ہر دو اجزاء نبوت کے موجود ہیں یعنی یہ کہ مجھے الہام وغیرہ ہوتا ہے، اور میری جماعت میں داخل نہ ہونے والا کافر ہے تو وہ شخص کاذب ہے اور واجب القتل ہے۔ مسیلمہ کذاب کو اسی بنا پر قتل کیا گیا تھا حالانکہ طبری لکھتا ہے کہ وہ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا مصدق تھا اور اس کی اذان میں حضور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی تصدیق تھی۔

لیڈنگ سٹرنگز (Leading Strings) سے مراد لیڈنگ سٹرنگز آف ریلجن نہیں بلکہ لیڈنگ سٹرنگز آف فیوچر پرافٹس آف اسلام ہے، یا یوں کہئے کہ ایک کامل الہام و وحی کی غلامی قبول کر لینے کے بعد کسی اور کی الہام اور وحی کی غلامی حرام ہے۔ بڑا اچھا سودا ہے کہ ایک کی غلامی سے باقی سب غلامیوں سے نجات ہو جائے اور لطف یہ کہ نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی غلامی نہیں بلکہ آزادی ہے کیونکہ ان کی نبوت کے احکام دین فطرت ہیں یعنی فطرت صحیح ان کو خود بخود قبول کرتی ہے۔ فطرت صحیحہ کا انہیں خود بخود قبول کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ احکام زندگی کی گہرائیوں سے پیدا ہوتے ہیں اس واسطے عین دین فطرت ہیں۔ ایسے احکام نہیں جن کو ایک مطلق العنان حکومت نے ہم پر عائد کر دیا ہے اور جن پر ہم محض خوف سے عمل کرنے پر مجبور ہیں۔ اسلام کو دین فطرت کے طور پر Realise کرنے کا نام تصوف ہے اور ایک اخلاص مند مسلمان کا فرض یہ ہے کہ وہ اس کیفیت کو اپنے اندر پیدا کرے۔ اس کیفیت کو میں نے لفظ Emancipation سے تعبیر کیا ہے۔ محمد اقبال

افسوس ہے کہ مرتب نے بعض عبارات کو انوار اقبال سے حذف کر دیا ہے جب کہ حضرت علامہ کی تحریر کے عکسی متن میں یہ الفاظ موجود ہیں، شاید کسی خوف کے مارے انہوں نے اس عبارت کو حذف کر دیا ہے)

اس سلسلہ میں حضرت علامہؒ کے اور بھی بہت سے خطوط ہیں، جن کو طوالت کی وجہ سے

یہاں نقل نہیں کیا جا رہا۔ علاوہ ازیں کئی بزرگان، جیسے امام العصر علامہ انور شاہ کشمیریؒ، علامہ سید سلیمان ندویؒ، سید الیاس برنیؒ، ناظم دارلترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی، حیدر آباد دکن، مولانا مسعود عالم ندوی وغیرہ نے خط لکھ کر ختم نبوت کے بارے میں بعض امور پر وضاحت طلب کی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کے آخری ایام میں علامہ کو فتنہ قادیانیت کے بارے میں غیر معمولی احساس ہو چکا تھا اور آپ کافی وقت اس کے بارے میں صرف کرتے تھے، حالانکہ آپ زندگی کے آخری سالوں میں اکثر صاحب فراش رہتے تھے۔

حضرت علامہ نے اپنے مختلف اشعار میں بھی اس مسئلہ ختم نبوت کو بیان فرمایا جسے ان اشعار میں فرمایا۔

پس خدا برما شریعت ختم کرد
بررسول ما رسالت ختم کرد
رونق از ما محفل ایام را
اوسل راختم وما اقوام را
خدمت ساقی گری باما گزاشت
داد مارا آخریں جامے کہ داشت
لانبی بعدی ز احسان خدا است
پردہ ناموس دینِ مصطفٰے است
قوم را سرمایہ قوت ازداست
حفظ سرّ وحدت ملت از وست
حق تعالٰی نقش ہر دعویٰ شکست
تا ابد اسلام را شیرازہ بست
دل زغیر اللہ مسلمان برکند

نعرۂ لاقوم بعدی می زند
عصرے من پیغمبرے ہم آفرید
آنکہ در قرآن خودرا ہم ندید
تن پیرست وجاہ مست وکم نگاہ
اندرویش بے نصیب از لاالہ
اے بعداز تو نبوت شد بہ ہر مفہوم شرک
بزم را روشن زنور شمع عرفان کردہ ای
پنجاب کے ارباب نبوت کی شریعت
کہتی ہے کہ یہ مومن پارینہ ہے کافر
وہ نبوت ہے مسلماں کے لیے برگ حشیش
جس نبوت میں نہیں شوکت وقوت کا پیام
ہو اگر قوت فرعون کے در پردہ مرید
قوم کے حق میں ہے لعنت وہ کلیم اللہی
ہے فقط وحدت افکار سے ملت
وحدت ہو فنا جس سے وہ الہام بھی الحاد
فتنہ ملت بیضا ہے امامت اس کی
جو مسلمان کو سلاطین کا پرستار کرے

(انوار اقبال: ص ۵۴، مرتبہ بشیر احمد ڈار، اقبال اکادمی، کراچی)

آخر میں ہم اس مقالہ کو حضرت علامہ کے شیدائی آغا شورش کاشمیری مرحوم کے تبصرہ پر ختم کرتے ہیں

''علامہ کے ان دونوں بیانوں نے (ختم نبوت کے متعلق) قادیانیت کو مسلمانوں کی ذہنی

فضا سے نکال باہر کیا اور قادیانی قلعہ مسمار ہو گیا۔ علامہ ان بیانوں کے بعد کچھ دن کم تین سال زندہ رہے۔ اگر پاکستان بن جانے پر زندہ رہتے تو اغلب تھا کہ مرزائی امت آغاز ہی سے اقلیت کا درجہ پا جاتی۔ ظفر اللہ وزیر خارجہ نہ ہوتا اور قادیانی پاکستان میں اقتدار حاصل نہ کرتے جو مختلف اور اصل سازشوں کا محرک ہوا۔ پاکستان میں نہ 1953ء کی تحریک ختم نبوت چلتی، نہ مسلمانوں کا خون ارزاں ہوتا، نہ مارشل لا لگتا، نہ ملک عسکری چنگل میں جاتا، نہ دولخت ہوتا، نہ قادیانیت عرب ملکوں میں صیہونیت کا ٹنی ہوتی، نہ عالمی سامراج اس سے گٹھ بندھن کرتا اور نہ عالمی سامراج کا آلۂ کار ہونے کی حیثیت میں اسے حوصلہ ہوتا"۔

علامہ اقبالؒ کی رحلت کے بعد ملکی سیاست کے رجعتی مسلمانوں اور سرکاری دوائر کے لادین فرزندوں نے قادیانیت کی طرفداری کا ڈول ڈالا۔ جب پاکستان بنا تو ظفر اللہ خان قادیانیت کے لیے ریڑھ کی ہڈی ہو گیا۔ قائداعظم کی وفات کے بعد سرکاری افسروں کی عیاشی اور بعض وزراء کی لادینی رنگ لائی۔ ان خواص ہی کی بدولت قادیانی مسلمانوں کی صف میں شامل ہو گئے۔ کئی ایک دانشوروں نے تنور شکم کا ایندھن لے کر سرکاری مسلک کی اعانت کا ناد پھونکا، لیکن کسی میں یہ حوصلہ نہ تھا کہ قادیانیوں کو مسلمان کہنے کے لیے عوام سے ہم کلام ہو۔ وہ ان محاسبین کے خلاف گلہ کرتے یا زہر اگلتے جو قادیانیت کا تعاقب کرتے اور قادیانیوں کو مسلمانوں سے الگ گردانتے تھے۔

سب سے زیادہ افسوسناک پہلو یہ تھا کہ جو لوگ فہم ونظر کے میدانوں میں علامہ اقبال کے وارث کہلا رہے تھے اور ان کے سوانح وافکار کو اپنی ملکیت قرار دیتے تھے، انہوں نے ایک آدھ استثناء کے سوا اس بات میں علامہ اقبالؒ سے فرار کیا، بلکہ صحیح تر یہ کہ غداری کی۔ علامہ اقبال کا عشق ختم المرسلین عام مسلمانوں کے دل میں راسخ ہو چکا تھا۔ اور من حیثیت الجماعت وہ قادیانیوں کے اسلام پر صاد کرنے کو تیار نہ تھے"۔

(تحریک ختم نبوت: ص ۱۳۰، شورش کاشمیری)